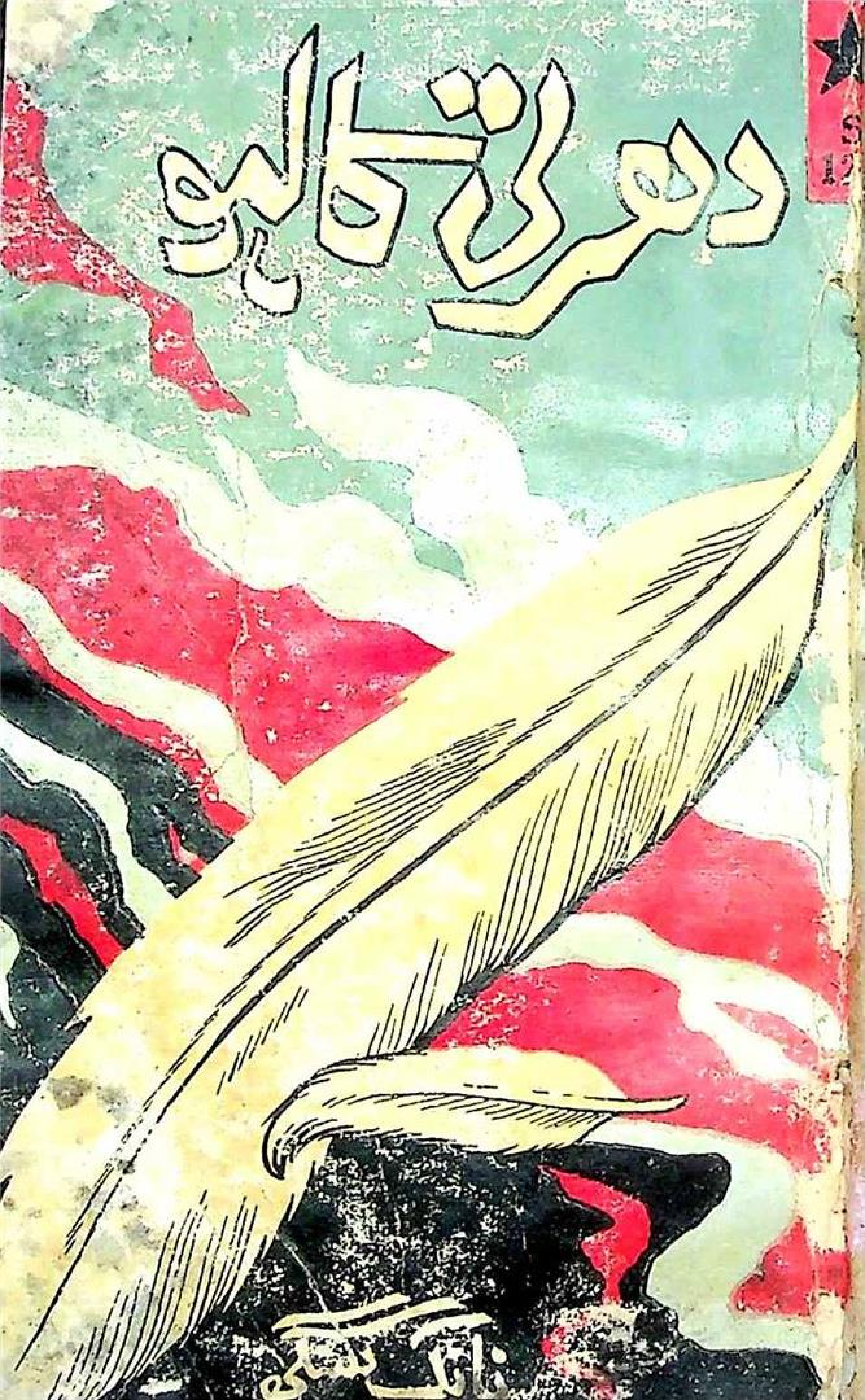
دھرتی کا لہو

سٹار پاکٹ بکس سیریز - ۱۴۷
دھرتی
کا لہو
نانک سنگھ

ناشر:

سنٹرل پبلیکیشنز
۲/۱۵، دریاگنج دہلی ۶

قیمت ایک روپیہ

سول ایجنٹس:

پنجابی پستک بھنڈار
دریبہ کلاں، دہلی ۶

Mukhdum Library
Kamalpura, S. N. 15
Malegaon (Dist. Nasik)

ISCUS LIBRARY
MALEGAON DIST. NASIK

ہمارا مقصد ہے

کم قیمت میں معیاری ادب پیش کرنا

اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر ہر مہینے میں دس پاکٹ بکس
شائع کیجاتی ہیں ـــــ اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ کتاب ہے

ـــــ ناشر ـــــ

Mukhdum Library
Kamalpura, S N 15
Malegaon (Dist Nasik)

Makhdum Library
Kundpura, S N 19
Malegaon (Dist. Nasik)
588/28

"کتنے اندھیر کی بات ہے چودھری جی! آپ ہی غور فرمائیے۔ ہر ایک بہو بیٹی والا ہے۔ گاؤں میں اس طرح کی بدفعلیاں ہونے لگیں تو کس طرح گزر ہوگی۔ اتنی عمر گزر گئی کبھی سُنی بھی نہیں تھی ایسی ذلالت نئی جوانی گویا اسی پر چڑھی ہے۔"

پوٹھوہار (مغربی پنجاب) کی پہاڑیوں کے دامن میں آباد یہ چھوٹا سا گاؤں اپنی خوبصورتی کے لئے مشہور ہے۔ اول تو قریب و دور چٹانوں کے درمیان کُھلے میدان کے جھول پر واقع ہونے سے، دوسرے اُس کے قدموں میں چھوٹے سے دریا سہاں کا چاندی جیسا صاف شفاف پانی مسلسل یکساں روانی سے بہتا رہتا ہے جس کے دونوں ساحلوں کی چپہ چپہ زمین بے داغ اور نرم و نازک پیاروں کی تاریخ ہے۔

سہاں کے البیلے پانی میں ضرور ہیر رانجھے کی بانسری جیسی کوئی کشش موجود ہے جو پیار بھرے دلوں کی گہرائیوں میں سسکتے غمِ فرقت کو جوار بھاٹے

میں تبدیل کر دیتی ہے۔

آج کل موسم سرما ہونے کی وجہ سے اس دریا میں پانی کافی اترا ہوا ہے پھر بھی اُس کی بدمست روانی میں کوئی عجیب و غریب کشش ہے۔ جو دور سے گذرنے والوں کا خیال جبراً اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اُس کے رتیلی ساحلوں پر کھڑے ہو کر دیکھنے سے دور تک گیہوں کے تازہ اُگے کھیت اور اُن سے دور میلوں تک پہاڑیوں کے نظارے آنکھوں میں ٹھنڈک اور دل میں جوش بھر دیتے ہیں۔

راولپنڈی کی سمت سے تلاگنگ کو جانے والی سڑک پر یہ گاؤں چکری آباد ہے۔ جس کے قریب دو ریلوے سٹیشن ہیں۔ ایک ڈھڑھیال اور دوسرا فتح جنگ۔ دوپہر کے وقت جب اگہن ماہ کا سورج اپنی گھنی شعاعوں سے ہر ٹھٹھری ہوئی چیز کو گرما رہا تھا۔ اور کھیتوں میں گیہوں کی بوائی کا زور شور تھا۔ اس گاؤں کے بیچوں بیچ ایک مکان کے صحن میں چند معزز لوگوں کی مجلس لگی دکھائی دے رہی تھی۔ گاؤں میں زیادہ تعداد مسلم نوجوانوں کی ہے۔ یہ لوگ خاندانی زمیندار ہونے کی وجہ سے خوشحال اور رکھ رکھاؤ والے ہیں۔ ان کے علاوہ چند مکان ہندو اور سکھوں کے بھی ہیں اس گاؤں میں اُن کا گذارہ بھی اچھا ہے اور تجارت کے علاوہ اُن میں سے کوئی کوئی زمینداری بھی کرتا ہے۔

گاؤں کا ساہوکار بھانے شاہ جسے بابا بھانا کے نام سے بھی مخاطب کیا جاتا ہے۔ اسی گاؤں میں نہ صرف کھتریوں (ہندو اور سکھوں دونوں کو اس علاقہ میں کھتری کہا جاتا ہے) میں ہی مکھیا ہے، بلکہ مسلمانوں میں بھی اُس کی عزت ہے۔۔ اسی بابے بھانے کی حویلی میں ہم اس وقت چند کھتری اور مسلمان بزرگ اور نوجوانوں کو دیکھ رہے ہیں۔

مسلمان تعداد میں سات آٹھ ہیں جو اپنے ہندو ساتھیوں سے کچھ ہٹ کر بیٹھے ہیں۔ شاید حقہ کی وجہ سے۔ جس میں گڑ ملے تمباکو کا دھواں اُٹھ اُٹھ کر چھت کی طرف اور وہاں سے پلٹ کر دروازے میں سے ہو کر کمرے میں آ رہا ہے۔ ہندو باری باری سے کش لیتے اور ساتھ ساتھ باتیں کرتے ہوئے کسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ پیشتر بیان کی گئی گفتگو ان موجودہ اشخاص میں ہوئی تھی۔ جس کے جواب میں زیادہ دیر تک سلسلۂ گفتگو جاری رہا۔

ستر سالہ بابا سہانا اس گاؤں کا ایک مشہور ساہوکار ہے۔ اپنی بڑی عمر اور لمبے تجربات کی وجہ سے وہ ساہوکار ہونے کے علاوہ گاؤں پنچایت کا صدر، بے سہاروں کا سہارا اور دیہاتی ڈھنگ کا عطار، عرضی نویس اور اور بھی بہت کچھ ہے۔

بابے سہانے کی گاؤں میں مقبولیت کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ وہ اُردو فارسی کا اچھا جانکار ہے۔ جس کی وجہ سے گاؤں میں جو بھی لکھا پڑھی یا کسی طرح کے عرضی پرچہ کا کام کسی پر آ پڑے تو اُنہیں کے ہاتھوں پورا ہوتا ہے۔ آج کی سکول کالجوں کی تعلیم کے مقابلہ میں خواہ بابے سہانے کی یہ فارسی دانی کچھ اہمیت نہ رکھتی ہو۔ لیکن اپنے دور کا تو وہ عالم ہی تصور کیا جاتا ہے۔

بابے نے اسی گاؤں کی مسجد میں تعلیم حاصل کی تھی۔ ساتھ ہی اپنے مولوی سے اُس نے "طب اکبری" اور "علاج الغربا" وغیرہ حکمت کی کتابیں بھی پڑھی تھیں۔ اُردو فارسی کی اُس دور میں سب ہی جگہ اہمیت تھی اور اُس کی تعلیم کے کورس نہایت مختصر ہوتے تھے۔ صرف شیخ سعدی کی دو کتابیں "گلستان" اور "بوستان" ہی تھیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہنا چاہیئے کہ تعلیم گلستاں سے شروع ہو کر بوستاں پر ختم ہوتی تھی۔ مسجد میں تعلیم پانے والے ہر طالب علم کو خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان

یہ دونوں کتابیں پڑھنی ضروری تھیں۔ لیکن قرآن کی تعلیم صرف مسلمان بچوں کے لئے مقرر تھی۔

آج ستر سال کی عمر میں بھی بابے بھانے کو اپنے اُستاد مولوی کی یاد نہ بھولی تھی، دورانِ گفتگو جب کبھی کوئی مثال دینی ہوتی تو وہ اکثر کہا کرتے۔

"ہمارے مولوی صاحب فرماتے تھے"......

اپنے مذہبی معاملات میں بابا کٹر نہ ہوتے ہوئے بھی اُن پر مکمل اعتقاد رکھتا تھا۔ رات میں سوتے وقت۔ صبح بیدار ہوتے وقت، غسل کرتے وقت، یا کہیں آتے جاتے وہ ضرور کچھ نہ کچھ کہتا رہتا تھا۔ خواہ یہ فعل کسی اصول یا مقصد سے متعلق نہ تھا۔ سنسکرت سے کچھ غلط سلط اشلوک، گروبانی سے ٹوٹے پھوٹے لفظ اور قدیمی شاعروں کے بھگتی کے جذبات سے پُر نظموں کے اشعار ـــ یہ سب ملا جلا ہی بابے کا پوجا پاٹھ تھا۔ خاص طور پر اس تک کو تو وہ اکثر گنگناتا ہی رہتا تھا ـــ "ستری نمو بھگونتے واسدیوا ـــ"

کئی پُشتوں سے وہ اس گاؤں کا ساکن تھا، باہری دُنیا سے حالانکہ اس کا اُس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن تعلیم یافتہ ہونے اور ذاتی تجربات کی وجہ سے اُسے ہر چیز کی تھوڑی بہت جانکاری حاصل تھی۔ اپنے تجارتی معاملوں میں بھی وہ نہایت سچائی اور ایمانداری کا استعمال کرتا تھا۔

گاؤں میں کوئی بھی جلسہ ہو، خواہ کسی کی شادی ہو یا تجہیز و تکفین۔ سب سے پہلے بابے کو بلایا جاتا۔ صرف اس لئے نہیں کہ گاؤں کی سب سے زیادہ معزز شخصیت تھا بلکہ اس لئے کہ وہ ہر طرح کے رسم و رواج سے آشنا تھا۔ خواہ ہندوؤں کی ہوں یا مسلمانوں کی۔ سب کے متعلق اُسے مکمل واقفیت حاصل تھی۔ جب کبھی گاؤں کی کوئی لڑکی پالکی میں سوار ہونے لگتی، بابا بھانے لاٹھی ٹھک ٹھکاتا

فوراً وہاں چلا جاتا۔ اور واسکٹ کی جیب میں سے ایک روپیہ نکال کر لڑکی کی ہتھیلی پر رکھ دیتا۔ اور اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتا۔

"سہاگ سلامت رہے بیٹی۔ ٹھنڈی ہوا آئے (یہ مقولہ نئی شادی شدہ لڑکیوں کی سلامتی کے لئے پیغام میں عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے) ہمیں بھول نہ جانا سسرال جاکر ـــ" اور آخری الفاظ ادا کرتے کرتے اُس کے چہرے کی جھریوں میں سنجیدگی جھانکنے لگتی۔ جب ڈولی اُٹھنے لگتی تو اُس کے چاروں بازوؤں میں سے ایک بازو بابے کا ہوتا جس پر لوگوں کے منع کرنے پر بھی وہ لاٹھی کا سہارا لے کر گاؤں کے باہر تک ہی پہنچا کر چھوڑتا۔ پھر ڈولی کو جب کہار اُٹھا لیتے تو بابا فوراً لال یا سندوری پوشاک پہنے دولہے کو جا گھیرتا ـــ "سن بچے! میری بات۔ بچی ہماری کو پھولوں سے تول کر رکھنا۔ یہ ہمارے گاؤں کی لکشمی ہے لکشمی ـــ!"

کھتریوں کی آبادی اس گاؤں میں مسلمانوں کے مقابلہ میں برائے نام ہی تھی۔ پھر بھی اُن کی زندگی ایک دوسرے سے اس قدر ملی ہوئی تھی کہ ایک دوسرے کے بغیر گذارہ مشکل ہوتا تھا۔

بابے بھانے کا مکان جس قدر وسیع اور گاؤں بھر میں اونچا ہے اُسی قدر اُس میں رہنے والوں کی کمی نظر آتی تھی۔ اس لمبے چوڑے مکان میں صرف تین جانیں آباد تھیں۔ ایک وہ، اُس کا بیٹا اور بیٹے کی بیوی۔"

اولاد کی صورت بابے کو زندگی کے آخری دنوں میں دیکھنی نصیب ہوئی تھی۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی کی۔ لیکن مشیت کو اس کا یہ شکوہ منظور نہ ہوا اور اُن دونوں میں سے ایک اُس سے لے لیا۔ باقی رہ گیا اُس کا اکلوتا بیٹا بوٹے شاہ۔ بدقسمتی سے بوٹے شاہ بھی اس خداداد نعمت سے ابھی تک جبکہ اُس کی عمر

نیس سے ادیرہ ہی کی کھتی محروم ہی تھا۔

کہا جاتا ہے کہ بیٹے بیٹیوں سے زیادہ عزیز ہوتے ہیں۔ لیکن بابے کی اکلوتی بیٹی کرشنا نے جس دن بابے کو داغِ مفارقت دیا، اُسے سات بیٹیوں کا غم ہوا۔ یہ بات گاؤں کے لوگوں کی زبان سے اکثر سنی جاتی ہے کہ اگر کرشنا کی کمی کو ایک دوسرے لڑکی کو پورا نہ کر دیتی تو شاید اس بوڑھے کا زندہ رہنا ہی مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو جاتا۔

بابے کا نیا مکان جو سارا ہی گڑے ہوئے پتھروں اور دیودار کی لکڑیوں کا بنا ہوا تھا اُس کی تعمیر کو پانچ چھ سال ہی ہوئے تھے۔ جب یہ بوٹے شاہ نے کھلے ہاتھوں دولت خرچ کرنے اُسے دلکش و خوبصورت بنانے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔

اس نئے مکان کے پیچھے بابے کا پرانا مکان بھی موجود تھا، جو اپنی کم اونچی چھتوں اور پرانے ڈھنگ کے دروازے کی وجہ سے بزرگوں کا زمانہ ظاہر کرتا ہے۔ آج کل اس پرانے مکان میں دو جانیں آباد تھیں، ایک ادھیڑ بیوہ۔ اور اُس کی جوان بیٹی۔

گاؤں کے ساہوکاروں کی یہ چھوٹی سی جماعت اُسی طرح حقے اور باتوں کے رس میں غرق بابے کا انتظار کر رہی تھی۔ پھر بھی جب اُنہیں کسی ٹھاکٹی کا کھٹکا سنائی نہ دیا تو اُن میں کچھ اُکتاہٹ کے اثرات پیدا ہو گئے۔

حقے کی نال دینے منہیار کی طرف بڑھا کر چودھری فضل کریم نے اپنی مہندی سے رنگی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"بھئی بابا جی نے تو بہت دیر لگا دی۔ میں نے تو آج تحصیل جانا ہے۔ ساتھ ہی اُدھر ٹوائی کرنے والوں کی طرف بھی پھیرا لگانا تھا۔"

بُجّا بڑھئی بولا۔ "کوئی بات نہیں چودھری! تفصیل کہیں بھاگی نہیں جا رہی۔
یہ روز روز کا جھگڑا ختم کر کے ہی جانا۔ اتفاق سے سبھی موجود ہیں۔ اگر کام کو دیکھو
تو مجھے آپ سب سے زیادہ جلدی ہے۔ بلونکے آتیا کی لڑکی کی شادی سر
پر آ چکی ہے اور پلنگ پیڑھے کے کام کو ابھی ہاتھ تک نہیں لگایا۔ صبح خراد پر
بیٹھا ہی تھا۔ اور ابھی پیڑھے کی گڈیاں ہی نکالی تھیں کہ آپ کا پیغام پہنچ گیا۔"

چودھری نے بھگتے برہمن کی طرف دیکھا۔ "جاؤ بھئی اوجھا جی۔ اندر سے
معلوم کرو کہ کتنی دور تک گئے ہیں بابا جی۔ بوٹے شاہ بھی گھر میں نظر نہیں آ رہا۔"

اپنے اودی چارخانے کے پرانے کوٹ کی لمبی آستینوں کو کہنی تک سمیٹ کر
بھگتو اٹھا ہی تھا کہ پچھلے کمرے سے "کھٹاک" اور "تری ممو بھگوتے واسدیوا۔"
کی آواز سن کر وہ اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

اور سبھی کی آنکھیں دروازے پر جا لگیں۔

Makhdum Library
Kamalpura, S N 15
Malegaon (Dist Nasik)

Makhdum Library
Kamalpura, S N 15
Malegaon Dist Nasik

داہنا بازو کمر پر ٹکائے اور بائیں ہاتھ میں لمبی لاٹھی کھٹ کھٹاتے ہوئے بابا کمرے میں داخل ہوا۔ اور آتے ہی سبھی سے مخاطب ہوا۔

"معاف کرنا، مجھے کافی وقت لگ گیا دہیں پر کیا کیا جائے، جہاں پر بھی جاؤ دو گھڑی لگ ہی جاتی ہیں۔" کہتے ہوئے وہ چودھری فضل کریم کے قریب بیٹھ گیا۔

بابے کہانے کا قد معمولی آدمی جیسا لمبا ہوتے ہوئے بھی کمر جھک جانے پر بھی کچھ ٹھگنا سا نظر آتا ہے، اُس کے سُرخ چہرے پر پُلاؤں جیسی لفمت تماشی ڈاڑھی جوانی اور ضعیفی کا میل معلوم ہوتی ہے۔ اگر یہ داڑھی سفید نہ ہو کر سیاہ ہوتی تو بلاشبہ بابا کسی نوجوان سے کم دکھائی نہ دیتا۔

کھدر کی معمولی قمیص پر دستی کی باریک دھاریوں کی کھیتوہی اور اوپر مٹ میلے رنگ کی کشمیری ٹپو کا کوٹ پہنے ہوئے بابا ایک بااثر شخصیت کا مالک ہے اُس کے نیچے سفید کھدر کی لانگ دار دھوتی ہے اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی لاٹھی کا

نچلا کنارا زمین پر گھس گھس کر دانتن جیسا ہو گیا ہے۔ موٹھ کے مقام پر انگلیوں کی رگڑ کے چھوٹے چھوٹے گڑھے پڑ گئے ہیں۔ اُس کے سر کے کپاس جیسے سفید نصف تراشے ہوئے چند بال پگڑی کے نیچے گردن کے قریب نکلے ہوئے نہایت خوشگوار نظر آرہے ہیں۔

"باباجی ــــ!" شکایت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ گلاب سنگھ کو ہی بولا۔ "آج تو آپ کی راہ دیکھتے دیکھتے بوڑھے ہو گئے ــــ کہاں کی بیگار آن پڑی تھی ــــ؟"

تب تک پیچھے کی دیوار کے ساتھ لاٹھی ٹیکتا ہوا بابا اپنی جگہ پر بیٹھ چکا تھا۔ دائیں ہاتھ سے اپنی گھنی مونچھوں کو ہٹاتا ہوا وہ بولا۔

"بیگار کیسی بھائی صاحب! صغرا کئی دنوں سے بیمار ہے اُسی کو دیکھنے چلا گیا تھا ــــ" اور بات کا رُخ بدلتے ہوئے بابا چودھری کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ــــ "آج کیسے قدم آئے غریب خانہ پر۔ خیریت تو ہے؟"

"خیریت کیسی باباجی ــــ!" چودھری فضل کریم بولا۔ "اب تو سچ پوچھو کوئی مزا نہیں رہ گیا اس گاؤں میں بسنے کا۔"

بابے کے چہرے پر فکر کے نقوش جھلک آئے اُس کا سر تھوڑا سا جُھکا اور بات کا مطلب سمجھنے کے لئے وہ چودھری سے سوال کرنے ہی والا تھا کہ اُس سے پیشتر کھگیتا برہمن اپنی ٹھوڑی کو انگلیوں سے سہلاتے ہوئے بول اُٹھا۔

"اتنا اندھیر تو باباجی سُنا نہیں تھا۔ اتنی بڑی عمر ہو گئی ہے، جوانی بھی دیکھی ہے ــــ لیکن ایسا ظلم، نہ بیٹی کا لحاظ، نہ بہن کی شرم۔"

"لیکن کس کی بات کہہ رہے ہیں پنڈت جی آپ؟" ــــ بابے نے اور زیادہ بے تاب ہو کر سوال کیا۔

"بات اُسی لنگڑے مستری کے بیٹے یوسف کی ہے۔ جو اپنے خاندان کی پیشانی کا ایک بدنما داغ ہے۔" میر بخش بھٹی بولا۔ "کسی نے سچ کہا ہے۔ سپوتوں کے کپوت اور کپوتوں کے سپوت۔ باپ نے کبھی آنکھ اُٹھا کر کسی کی طرف دیکھا تک نہیں اور بیٹے کی کرتوتیں دیکھو۔ جس تھالی میں کھانا، اُسی میں سوراخ کرنا۔"

"یہاں پر بات وہ ہوئی۔" ہیرا سنگھ کوچھڑ نے اپنی ڈھیلی پگڑی سنوارتے ہوئے کہا۔ "کہتے ہیں ایک کریلا۔ دوسرے نیم چڑھا۔ اوپر سے لگ گئی ہے سپاہی پن کی ڈیم، ایسا بھی کیا کہنا۔ سچ تو یہ ہے باباجی! آپ کا لحاظ مار رہا ہے، اُس لئے کہ آپ کے بوٹے شاہ کا پگڑی بدل دوست بنا ہوا ہے اگر کوئی اور ہوتا تو......"

بولتے بولتے وہ نوجوان زیادہ جوش میں آگیا اور اس ڈر سے کہ کوئی ناجائز لفظ زبان سے نہ نکل جائے، خاموش ہوگیا۔

آخر میں چودھری فضل کریم نے اس کے متعلق جو کچھ وہ جانتا تھا تفصیل سے بابے کے روبرو بیان کر دیا۔

"سُنتے ہی بابے کا چہرہ تپتے ہوئے تلنبے جیسا ہوگیا۔ اول تو وہ گاؤں میں ہر بہو بیٹی کی عزت آبرو اپنی سمجھتا تھا۔ دوسرے اس معاملے میں جس لڑکی کا نام لیا گیا وہ نام بندوق کی گولی بن کر اُس کے سینے کو چھیدتا ہوا چلا گیا۔ اُس کے بڑھاپے میں جوانی کا سا جوش پیدا ہوگیا۔ اور اُس کی آنکھیں روحانی درد سے شنکر کی تیسری آنکھ کی طرح اُبلنے لگیں۔ کنپٹیوں سے پیشانی تک اُس کی نسیں پھول گئیں۔ لیکن اُس کے باوجود اُس نے خود کو بے قابو نہ ہونے دیا۔ صبر کے ساتھ سب کی طرف دیکھ کر بولا۔

"کسی نے آنکھوں سے دیکھا بھی ہے یا سُنی سُنائی باتیں کر رہے ہو؟"

"سُنی سُنائی ——— !" گلہ زری کی موٹی چادر میں سے بازو نکال کر حقے کی نال پکڑتے ہوئے نیاز نکھر بولا ——— "یہ اللہ دتہ بیٹھا ہے آنکھوں سے دیکھنے والا ...... پوچھ لیجئے دین و ایمان کی قسم سے۔" اُس نے قریب بیٹھے ہوئے اللہ دتہ کی طرف دیکھا۔

"اللہ دتے ——— !" بابے کی سنجیدہ آواز میں کچھ لرزش سی شامل تھی۔

"مسلمان ہے ...... ؟"

"شکر الحمد للہ ———" اللہ دتے نے مذہبی جوش میں آ کر کہا۔

"پڑھ کلمہ ———" بابے کی نظر اور آواز میں حاکمانہ رعب تھا۔

دونوں ہاتھ ایک دوسرے کے ساتھ جوڑے ملا کر اور اُنہیں سینے کے آگے پھیلاتے ہوئے اللہ دتے نے پڑھنا شروع کیا ———

"لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ ———"

"جو کچھ آنکھوں سے دیکھا ہے اُسے اپنے خدا کو حاضر و ناظر جان کر کے سچ بتانا ———" بابے نے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔

"بابا جی ! ———" اللہ دتے نے نظریں اُٹھائیں ——— "سات دوزخوں کی آگ میں جلوں اگر آپ کے روبرو کفر بولوں ———"

اُس نے تفصیل وار بیان کرنا شروع کیا۔

"گذشتہ جمعرات کو میں اپنے ننھیال کولیاں گیا ہوا تھا۔ میرے ماموں کے لڑکے کی طبیعت خراب تھی۔ آج صبح منہ اندھیرے میں وہاں سے روانہ ہوا تو دن چڑھتے چڑھتے گاؤں پہنچ گیا ——— جب بابا جی آپ کے کنوئیں کے قریب سے گذرا تو نیچے میں سے کچھ شور سُنائی دیا۔ میں نے یہ سمجھا کہ شاید

آپ کا مزارعہ عیدا مالی اپنے بھتیجے سے لڑ رہا ہو گا۔ ہر روز جو جابجا بھتیجے میں جرت بیزار ہوتی رہتی ہے۔ میں نے سوچا کہ ممکن ہے کسی کو چوٹ وغیرہ لگ جائے۔ اپنا راستہ چھوڑ کر بغیچے میں گھس گیا۔

آواز جھیری میں سے آ رہی تھی۔ جیسے ہی میں نے اندر جھانکا۔ اللہ گواہ ہے۔ دیکھتے ہی میرے دل میں آگ بھڑک اُٹھی۔ یوسف نے نسیم کو بازوؤں میں جکڑ رکھا تھا۔ اور وہ بے چاری بلند آواز میں گالیاں نکال رہی تھی اور ناخنوں اور دانتوں سے اُسکے کپڑے پھاڑ رہی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے نسیم نے دو تین تھپڑ بھی اُسے رسید کئے اور اتنی زور سے کاٹا کہ اُس کا بازو لہولہان ہو گیا۔......"

"اور ــــ ؟" بابے نے تیزی سے سانس لیتے ہوئے پوچھا۔ اللہ دتے نے لمحہ بھر رُک کر پھر بتانا شروع کیا۔

"مجھے دیکھتے ہی یوسف نے نسیم کو چھوڑ دیا۔ اور نسیم دیکھتے ہی دیکھتے باہر نکل کر گاؤں کی جانب بھاگ گئی۔ اب وہ کمینہ لگا مجھ سے جھگڑتے۔ مجھ سے تیس سپارہ قرآن کی قسم اُٹھوا لیجیئے۔ میں نے تو صرف یہی کہا تھا "کیوں رے یوسف! یہ کیا ہے ــــ؟ شرم تو نہیں آتی تجھے ایک جوان لڑکی سے ہاتھا پائی کرتے ہوئے" آگے وہ چھوٹتے ہی کہنے لگا ــــ "جا بھاگ جا یہاں سے، ورنہ تجھے پھوڑ دوں گا ــــ" آپ جانتے ہیں بابا جی! ہر کوئی مٹھی بھر اناج کھاتا ہے۔ میرے جسم میں بھی چار قطرے خون کے تھے۔ اس قدر بے غیرت تو تھا نہیں کہ آنکھوں کے آگے بچی کی بے حرمتی دیکھ کر اُس کی گیدڑ بھبھکیاں برداشت کر لیتا۔ قمیص کی آستین چڑھا کر میں بولا ــــ "آ بیٹے! تجھے چکھاؤں مزا ــــ" لیکن چور کے پاؤں کہاں

جب دو تین گھونسے ٹھوڑی پر کھائے تو الگ پڑا جی گھگھیانے۔ کہنے لگا ——
"اللہ دتے! خدا کے واسطے میری کرنی پہ پردہ ڈال دے، تو میرا بھائی
چوٹھہرا۔"

مجھ پہ تو قہر سوار تھا۔ میں نے کہا —— "ٹھہر جا، تیرے بھائی کی ایسی کی
تیسی ..." گردن سے پکڑ کر جو جھٹکا تو منہ کے بل جا گرا اور لگا دانت نپورنے
کہنے لگا جیسے بھی ہو میری عزت بچا لے۔ میں نے کہا۔ "ارے حرامی! گاؤں
کی بیٹی سے تیری عزت کہیں بہت بڑی ہے۔ شاید تو یہ سمجھتا ہے کہ لڑکی کا باپ
سر پہ نہیں ہے اور جی میں آئے جھڑے کے سکے چلائے گا۔ اس کی آنکھیں نہ
نکال لیں جو ہمارے گاؤں کی بیٹی پر آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔ بس پھر کیا ہوا ——
یوسف کی ماں مرجائے پھر جو کبھی سایا ہو۔"

"کون کہتا ہے۔ لڑکی کے سر پہ باپ نہیں ہے، جب تک اس
بوڑھے جسم میں جان ہے اسے کوئی یتیم نہیں کہہ سکتا۔" بابے نے کڑک کر
کہا۔

"سچ بات ہے ——" چودھری فضل کریم بولا —— "باپ سے بھی بڑھ کر
دکھا دیا ہے آپ نے بابا جی! اگر آپ کا ہاتھ ان دونوں کے سر پہ نہ ہوتا تو یہ
دونوں بے چاری نہ معلوم کہاں بھٹکتی ہوتیں۔ سچ بات ہے، آپ نے اس کنبہ
کی جڑیں پاتال تک لگا دی ہیں۔ باپ کی جگہ یہ ہیں بابا جی۔ بات کہتے شرم
محسوس ہوتی ہے۔ بھلا اس لفنگے یوسف کی کیا مجال تھی جو اس قدر دلیری
دکھاتا —— یہ جو کچھ اس نے کیا میرے خیال میں کسی دوسرے کی ہمت پہ
کیا ہے۔"

"دوسرے کی ہمت پہ —— !" بابے کی انگارے کی طرح تکتی ہوئی

آنکھیں گرم ہو اُٹھیں ـــــــ "وہ کون ہے اس طرح کی شہ دینے والا،"

یہ بات اب با پردہ ہی رہنے دیجئے بابا جی۔" چودھری نے جھجکتے ہوئے کہا۔
لیکن بابے کے لیئے انتظار اور بھی زیادہ غصہ بڑھا دینے والا تھا۔ وہ بولا۔
"چودھری! پنچ بھگوان کی صورت ہوتے ہیں۔ ان کے روبرو کوئی بھی بات با پردہ نہیں رکھنی چاہیئے۔ بغیر کسی طرح کی جھجک کے اُس کا نام لو ـــــــ"

"بابا جی!" چودھری بولا ـــــــ "کس طرح زبان کھول کر آپ کے سامنے یہ بات بیان کروں۔ سچ پوچھیئے تو میرا اپنا دل بھی گواہی نہیں دیتا کہ یہ بات سچ ہوگی۔ لیکن ثبوت کچھ اور ہی کہتے ہیں"

"نہیں نہیں ....." بابے کی آواز میں حاکمانہ تلخی تھی ـــــــ "طرفداری کا پنچایت میں کوئی کام نہیں۔ اس طرح گاؤں میں بدفعلیاں ہونے لگیں تو لاکھ لعنتیں ہیں ہماری اور تمہاری زندگی پر۔ خواہ میرا سگا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ میں ایسے غنڈے کو کبھی معاف نہیں کر سکتا ـــــــ ہاں کون تھا وہ جس کی شہ پا کر یوسف نے اس طرح کی حرکت کی۔؟"

چودھری نے عاجزی سے کہا ـــــــ "اگر در اصل آپ کے بیٹے کی بات ہی یہ بات ہو تو ـــــــ؟"

"پھر ـــــــ" بابے کے ہونٹ لرزے ـــــــ "پھر میں اسی وقت، اس جیسے کپوت کو گھر سے نکال ...." بولتے بولتے بابے کی آواز اس قدر بند ہو گئی کہ وہ کھانسنے لگا۔ جس کی وجہ سے وہ اپنی بات مکمل نہ کر سکا۔

"مجھے معاف کرنا بابا جی ـــــــ!" چودھری نے رُک رُک کر کہا۔

"صبح بوٹے شاہ لے کر گیا تھا نسیم کو اُس بیچنے میں۔ اتنی بات تو خود میں نے بھی دیکھی ہے اپنی آنکھوں سے ــــ"

"ہوں ــــ"

"ہاں ــــ"

"بوٹا اُس کے ساتھ گیا تھا ــــ؟"

"جی ــــ"

"بابے کی گویا زبان کسی نے کھینچ لی ہو' اب نہ گویا اُس میں بولنے کی طاقت تھی اور نہ ہی کسی کی طرف نظر بھر کر دیکھنے کی سکت۔ اُس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں اور اُن میں کس طرح کے اثرات رقصاں تھے کوئی دیکھ نہ سکا۔ صرف اُس کے جسم کی لرزش سب کو نظر آ رہی تھی۔

کافی دیر تک دم گھوٹنے والی خاموشی طاری رہی۔ تھوڑی دیر بعد بابا نے سر اُٹھایا' آنکھوں میں روانی پیدا کی۔ اور پچھلے دروازے میں جس سے وہ داخل ہوا تھا' اُس کے ایک گوشہ میں رکھی ہوئی لاٹھی اُٹھاتے ہوئے بلند آواز میں کڑک کر بولا۔

"بوٹیا ــــ' ارے ــــ او بوٹے!"

اُس کے جواب میں اندر سے آواز آئی۔

"آ رہا ہوں بابو جی ــــ"

●●●

جونہی بوٹے شاہ سامنے آیا بابے جی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اور لاٹھی کا ایک بھرپور وار اُس نے بوٹے شاہ کی پیٹھ پر کر دیا۔ جس سے اُس کا جسم کمان کی طرح جھک گیا۔ اور وہ لڑکھڑا کر چودھری فضل کریم کے قریب آ گرا۔

"اس قدر سختی مناسب نہیں بابا جی!" بوٹے شاہ کی پیٹھ سہلاتے ہوئے چودھری بول اُٹھا۔

"سختی نہ کروں ــــ؟" سر کو اِدھر اُدھر ہلاتے ہوئے بابا کر

"چودھری! آپ کہتے ہیں سختی نہ کروں ــــ اس نے مجھے کہاں بیٹھنے کے قابل چھوڑا ہے۔ اتنی عمر گذر گئی اس کی۔ اس نے بتایا تک نہیں کہ اسکے منہ میں کتنے دانت ہیں۔ جہاں کہیں بھی ذکر ہوتا۔ میں کہا کرتا تھا کہ میرے بیٹے جیسا بیٹا ہر ایک کے گھر ہو۔ کسی کو بھی معلوم نہ ہوتا تھا کہ یہ کس راستے

سے آتا ہے اور کس سے جاتا ہے —"

اور پھر بیٹے کی طرف دیکھ کر غرایا۔

"نہ ہوتا بھگوان کے لیے تو بہتر تھا۔ اگر مجھے ان باتوں کا پتہ ہوتا تو میں تجھے پیدا ہوتے ہی کیوں نہ زہر چٹا دیتا۔ بے غیرت۔ اگر بھلا چاہتا ہے تو نکل جا اسی وقت گھر سے۔ ورنہ میرے لیے تو لے پھر سنکھیا لا کر دے دے۔"

بوٹے شاہ کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس نے کافی کوشش کی۔ لیکن اس کے حلق سے کوئی آواز نہ نکل سکی۔ آخر ساری طاقت لگا کر جیسے بالٹی پر آری چلنے جیسی کھڑکھڑاتی آواز میں بولا —"باپوجی! میری نیت میں کوئی برائی نہ تھی —"

"تیری نیت میں کوئی برائی نہ تھی —" باپ نے منہ چڑاتے ہوئے کہنا شروع کیا —"تیری نیت میں کیسے برائی ہو سکتی تھی۔ تیرا پیر تھا وہ جس کی زیارت کرانے کے لیے اس لڑکی کو لے گیا تھا۔ ساتھ چوری بھی، ساتھ چتر بھی —" بولتے بولتے باپ کے ہونٹوں کے دونوں سروں پر معمولی سی جھاگ آ گئی۔

"بول کیوں لے گیا تھا اسے —؟" بیٹے کی خاموشی پر اور زیادہ خفا ہوتے ہوئے اس نے پوچھا۔ لیکن پھر بھی بوٹے شاہ خاموش رہا۔ ایک مرتبہ پھر چودھری کے ہاتھ سے لاٹھی چھیننے کی کوشش کرتے ہوئے وہ بولا۔

"سانپ سونگھ گیا ہے کیا؟ میں کیا پوچھ رہا ہوں تجھ سے؟"

"باپوجی! —" اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے وہاں جوتیوں میں کھڑے کھڑے بولا — سب کچھ بتائے دیتا ہوں باپوجی۔ سب کچھ سن کر بھی آپ مجھے قصوروار سمجھیں تو میں آپ کے اور ان پنچوں کے سامنے

منہ کالا کرکے اور گدھے پر سوار ہو کر گاؤں سے نکل جاؤں گا۔"

"نہیں نہیں برخوردار، ایسا نہ کہو۔۔۔" کہتے ہوئے چودھری نے اُٹھ کر اُسے جوتیوں والی جگہ سے کھینچ کر اپنے قریب لانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ یہ کہتے ہوئے وہیں کھڑا رہا۔۔۔ "نہیں چچا جان، جب تک باپو جی نہ کہیں گے میں یہیں کھڑا رہوں گا۔۔۔"

"بیٹھ جا۔۔۔" ایک کڑکتی آواز اُسے اپنے والد کے لرزتے ہونٹوں سے سنائی دی۔ بوٹے شاہ وہاں سے ہٹ کر چودھری کے گھٹنے قریب آ بیٹھا۔

وہ ابھی بیٹھنے ہی پایا تھا کہ بابے کا ہاتھ پھر اپنی لاٹھی پر جا ٹکا۔ جسے دیکھتے ہی چودھری نے اس کا بازو تھام لیا۔ "بس بس بابا جی! پہلے آپ کا لحاظ کیا تھا، اب مت لاٹھی کو پکڑنا۔۔۔"

"نہیں نہیں میں کچھ نہ کہوں گا۔۔۔" کہتے ہوئے بابا اُسی اپنے مقام سے اُٹھا اور بغیر کسی سے کچھ کہے سُنے وہ پچھلے راستے سے اندر چلا گیا۔

اندر سے جب وہ لوٹا تو سب نے اُس کے ہاتھ میں رسّی سے بندھی ایک پیتل کی گڑوی دیکھی۔ جس کا مُنہ ٹین کے ٹکڑے اور لاکھ سے بند کیا ہوا تھا دیکھنے والوں میں مسلمان بھلے ہی اُس کی اہمیت کو نہ سمجھ پائے ہوں۔ لیکن ہندو سکھوں کو اُسے سمجھنے میں دیر نہ ہوئی۔

آتے ہی بابا جی نے وہ گڑوی اپنے بیٹے کے سر پر ٹکاتے ہوئے ویسی ہی ناراضگی سے پوچھا۔

"بتا یہ کیا ہے؟"

"گنگا جلی ہے بابا جی!"

"اسی گنگا جلی کی قسم کھا کر کہہ کہ سب سچ سچ بتائے گا۔"

"گنگا جلی کی قسم کھاتا ہوں، سب سچ سچ کہوں گا—"

اُس کے بعد بوڑھے شاہ نے شروع سے آخر تک سارا واقعہ بیان کر دیا جس کے ختم ہوتے ہوتے سننے والے اس قدر متاثر ہو اُٹھے کہ گویا اُن کے سامنے بوڑھے شاہ کی بجائے فرشتہ بول رہا ہے۔

چودھری فضل کریم بار بار کہے جا رہا تھا "مجھے تو پہلے سے ہی اس کا یقین نہ ہو رہا تھا۔ ہمارے ہاتھوں میں ہی تو کھیل کر ہوش سنبھالا ہے۔ کیا آدمی کی شناخت کی اتنی بھی عقل نہیں ہے۔

اپنے بیان کے آخر میں بوڑھے شاہ نے یہ اور کہہ دیا۔

"آپ سب لوگ بابو جی کے برابر ہیں اور پھر پنچ تو بھگوان کی صورت ہوتے ہیں۔ میں نے گنگا مائی کو حاضر و ناظر جان کر سب کچھ سچ سچ بیان کر دیا ہے۔ لیکن پھر بھی اگر آپ لوگوں کو یا بابو جی کو میری کسی بات میں فریب نظر آتا ہو تو آپ لوگوں کے جوتے اور میرا سر—"

بوڑھے شاہ کا بیان سُننے کے بعد کسی کے پاس کہنے سُننے کے لئے کچھ نہ رہ گیا تھا۔ تھوڑے دیر کے بعد مجلس برخاست ہو گئی۔

Makhdum Library
★ Kamalpura, S N 15 ★
Malegaon (Dist Nasik)

The Blood of Earth.

دھرتی کا لہو

دو مختلف قوموں کے گھرانوں میں اس قدر گہری دوستی، جو دوستی سے بڑھ کر قریبی رشتہ داری میں تبدیل ہو گئی ہو خواہ آج اسے عجیب و غریب یا نامناسب تصور کیا جائے۔ لیکن اُن دنوں میں یہ نہ تو عجیب بات تھی اور نہ ناممکن۔

پنجاب کا یہ علاقہ جسے پوٹھوہار کہا جاتا ہے۔ اُس کے ہر ایک گاؤں شہر میں اس طرح کی بے شمار مثالیں آج سے چند سال بیشتر اکثر جگہ مل جاتی تھیں۔

ویسی ہی تھی کلہڑی گاؤں کی لوگوں کی کنبہ پرستی۔ دونوں گھرانے ایک دوسرے کے پڑوسی تھے۔ رحیم بخش کا گھرانہ اور بابا بھانا مل کا گھرانا — دونوں کے دو دو بچے تھے۔ ایک ایک لڑکا اور ایک ایک لڑکی۔ رحیم بخش جب تک زندہ رہا۔ بابا بھانا مل کو اپنا بڑا بھائی مانتا رہا۔ مردوں کی بہ نسبت عورتوں میں بے پناہ محبت تھی۔ خاص طور پر دونوں

لڑکیاں نسیم اور کرشنا تو بچپن سے ہی ایک دوسری کو سگی بہنیں مانتی تھیں۔
دونوں ہم عمر بھی تھیں۔

اسی دوران موت کا ایک ہی سال میں دونوں گھروں پر سایہ پڑا۔
ادھر رحیم بخش کی زندگی کا چراغ گل ہوا۔ ادھر کرشنا کا۔ بد نصیبی جو کرائے وہ تھوڑا۔ ایک گھر کا سایہ ہٹ گیا تو دوسرے گھر کی پھپھاتے ہوا چراغ پہ آ گئی۔ لیکن بدنصیبی کو خوش نصیبی نے شکست دیدی۔ کرشنا کی کمی کو نسیم نے پورا کیا۔ اور رحیم بخش کی کمی کو بابا بھجنا نے۔

یوں تو بیوہ ہو جانے پر صغرا کا کوئی سہارا نہ رہ گیا تھا لیکن جیسے ہی ایک محبت بھرا ہاتھ آگے بڑھا کہ صغرا کی تمام فکریں ختم ہو گئیں رحیم بخش کا جنازہ اٹھنے سے بیشتر ہی بابا بھلنے نے کہہ دیا تھا اس سے ۔۔۔ "کیوں رو رو کر آنکھیں گنوا رہی ہو صغرا! اپنے بھائی کو واپس لانا میرے قابو کی بات نہیں ہے لیکن اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ میرے جیتے جی تجھے کسی بات کی کمی کوئی نہ رہے گی۔ اور پوتا اگر اپنے باپ کا بیٹا ہے تو عزیزا ور سیما کو سگے بھائی بہن سے کم نہ سمجھے گا۔"

نسیم کو ہر کوئی نصف نام سے سیما کہہ کر پکارتا تھا۔

سارا گاؤں اس بات کا گواہ ہے کہ بابا بھانے نے جو بات ایک دفعہ زبان سے نکالی تھی۔ اس کی تکمیل میں اس نے کبھی کوتاہی نہیں کی۔ خاص طور سے جب سے کرشنا وقت سے پہلے ہی اس جہان فانی سے رخصت ہوئی ہے اس وقت سے تو ان کے کنبہ کے لوگ نسیم کو ہی کرشنا ماننے لگے ہیں۔ شاید اس لئے بھی کہ دونوں بچیوں کی عمر برابر تھی۔ اور دونوں کے درمیان رنگ روپ اور عادتوں میں مشابہت تھی۔

اُس کے بعد صغرا کے لڑکے عزیز کو جب دور کے ایک رشتہ دار نے راولپنڈی لے جاکر ملازمت دلادی تو صغرا اور نسیم کے لیئے اس خاندان کی ذمہ داریوں میں اور اضافہ ہو گیا۔ در اصل اسی وجہ سے بابا بھاتا ان دونوں ماں بیٹی کو اُن کے خستہ جھونپڑے سے اپنے پُرانے مکان میں لے آیا۔ اس لیے کہ جس گھر میں صغرا رہتی تھی وہ گاؤں کے باہر کی طرف تھا اور وہاں چوری وغیرہ کا بھی خطرہ بنا رہتا تھا۔

عزیز نسیم سے تین سال بڑا ہے۔ دونوں بھائی بہن بوٹے شاہ کو بھائی جان اور بابا بھاتا کو باپو جی کہہ کر پکارتے ہیں۔

جب سے عزیز نے راولپنڈی میں کسی صاحب کے یہاں ملازمت کی ہے تب سے بوٹے شاہ کو اِن دونوں ماں بیٹیوں کی طرف خاص توجہ دینی پڑ رہی ہے۔ گھر کے راشن سے لے کر گلے کے چارے تک کی تمام ذمہ داریاں اُس نے خود پر لے لی ہیں۔

دن میں ایک دو مرتبہ وہ ضرور ہی اُن کے گھر جاتا اور خیریت معلوم کر آتا تھا۔

نسیم سے مل کر بوٹے شاہ کو نہ صرف اپنی مرحومہ بہن کا پیار ملتا ہے بلکہ بچوں کو پیار کرنے کی بھوک بھی مٹتی ہے۔ وجہ یہ کہ اُس کی شادی ہوئے سالوں گذر چکے ہیں لیکن بھگوان نے اُسے اولاد کا مُنہ نہیں دکھایا۔

گذشتہ سال عزیز کی سگائی قریب کے ایک گاؤں میں ہو چکی ہے۔ شادی کب ہوگی یہ ابھی تک طے نہیں ہو پایا۔ بابے بھاتے کی خواہش ہے کہ عزیز سے پہلے نسیم کی شادی ہو جائے۔ وہ اکثر کہا کرتا ہے۔ لڑکے کی کیا فکر ہے اُس کی شادی تو ہو ہی جائے گی۔ لیکن اپنی زندگی میں سیما کے ہاتھ پیلے کر پاؤں، یہی فکر

مجھے کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتی۔

اپنی طرف سے اُس نے کوششوں میں کمی نہیں کی لیکن اُسے ابھی تک اپنی پسند کا لڑکا نہیں مل پایا۔

نسیم کو اٹھارھواں سال لگ چکا ہے۔ لیکن وہ اپنی تعلیم یافتہ اور ہر کام میں ہوشیار دھرم کی بیٹی کو کسی گنوار کے گلے کیسے باندھ دے۔

دونوں بھائی بہنوں نے جس قدر تعلیم گاؤں کے پرائمری اسکول میں حاصل کی تھی۔ اُس سے کہیں زیادہ اُنھوں نے بابا بھانا سے حاصل کی تھی۔ اس لحاظ سے بابا بھانا نہ صرف اُن کے دھرم کے باپ تھے بلکہ اُستاد بھی تھے۔

•••

ادہر اُس واقعہ یا حادثہ کا پس منظر ــــــ ؟

شام ہو رہی تھی۔ گائے کے لیے سانی تیار کر چکنے کے بعد نسیم اُسے دوہنے کی تیاری کر رہی تھی۔ کوہنی تک آستین چڑھی ہونے کی وجہ سے اُس کی گوری اور نرم و نازک کلائیوں پر ابھی تک بھوسے کے ننھے ننھے تنکے چپکے ہوئے تھے۔ اُسی وقت اُسے سُنائی دیا۔

" اری پگلی! اتنی سردی میں باہر کیا کر رہی ہے؟"

اور دوسرے لمحے ہی بوٹے شاہ اُس کے سامنے موجود تھا۔ جھٹ ... سے اُس نے دوپٹہ اُٹھا کر اوڑھ لیا۔ اور جواب دیا۔

"گائے دوہنے لگی تھی بھائی جان! چلیے اندر چلیے۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

" یہ کام بعد میں ہو جائے گا ــــ " بوٹے شاہ بے چین انداز میں بولا۔ " پہلے چل کر میری دو چار باتیں سُن لے۔"

دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ نسیم پوچھنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ کونسا

ضروری کام ہے۔ لیکن اُس بات سے بے خبری بوڑھے شاہ بول پڑا۔

"سیما! اچھا ہی ہوا کہ تیرے چاچی گھر پر نہیں، آج میں تنہائی میں تیرے ساتھ کچھ باتیں کرنی چاہتا ہوں۔"

کچھ تعجب سے نسیم نے اُس کی طرف دیکھا۔ لیکن اُس کے تعجب میں کسی طرح کی جھجک... یا بے اعتباری نہ تھی۔

"تنہائی میں ....؟" اُس نے پوچھا۔

"ہاں ـــ" بوڑھے شاہ ٹھیک طرح بیٹھتے ہوئے بولا ـــ

"لیکن اس سے پہلے میری ایک بات مانئے بھائی جان!" نسیم نے اپنے پتا سے کہا۔

"کیا ـــ؟"

"میں گائے دوہ کر لاتی ہوں۔ ایک گلاس تازہ دودھ پی لیجئے۔"

"کچا دودھ تو میں نے کبھی پیا نہیں۔ تجھے پتہ ہے سیما! بادی کرتا ہے مجھے ـــ"

"بادی نہ بادی ـــ" نسیم نے ضد بھرے انداز میں کہا ـــ "کبھی تازہ دودھ بھی بادی کرتا ہے؛ تھوڑی دیر بیٹھئے میں ابھی لے کر آئی۔"

"پگلی بیٹھ جا ـــ تجھے جو کہا ہے۔ باتیں بھی تجھ سے بہت سی کرنی ہیں۔ چاچی کے آنے سے پہلے ـــ"

نسیم کا جوش کچھ سرد پڑ گیا۔ ایک مرتبہ پھر اُس نے اپنی بات منوانے کیلئے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن بوڑھے شاہ کی مرضی دیکھ کر اُس نے کچھ نہ کہا۔

"بتائیے ـــ!"

"اچھی طرح اوپر ہو کر بیٹھ نہ ـــ!"

وہ ٹانگیں سمیٹ کر کھاٹ پر ٹھیک طرح سے بیٹھ گئی۔

"سیما ــــ"

"جی ــــ"

"عزیز سے تیرا کیا رشتہ ہے ؟"

"یہ کیوں پوچھتے ہو بھائی جان ؟"

"کسی بھی لیے پوچھوں۔ تو بتا !"

"جو رشتہ میرا آپ سے ہے ــــ"

"واقعی تو مجھے عزیز کی طرح بھائی سمجھتی ہے ــــ ؟"

"عزیز سے بھی زیادہ بھائی جان۔ آپ بڑے ہیں وہ چھوٹا ــــ"

"تو بتا یہ بتا۔ بڑے بھائی کو یہ حق ہے کہ چھوٹی بہن سے جو دل چاہے پوچھے ــــ"

"ہاں بھائی جان۔"

"تو جو کچھ پوچھوں گا اُس کا جواب صحیح صحیح دے گی۔"

"کیوں نہیں دوں گی ؟"

"سیما تجھے معلوم ہے تیری عمر کیا ہے ؟"

"اٹھارہ سال ــــ" نسیم نے کچھ جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

"تو کیا ہمیں تیری شادی کے متعلق سوچنا نہ چاہیئے۔"

سُن کر گویا نسیم کے چاروں طرف شرم کی بلند دیوار کھڑی ہو گئی ــــ اُس کے گورے چہرے پر سرخی پھیل گئی۔ شرم کی لہر اُس کے سر سے پاؤں تک دوڑ گئی۔ نگاہیں جھک گئیں۔ اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"تو نے وعدہ نہیں کیا سیما کہ جو کچھ میں سوال کروں تو اُس کا صحیح صحیح جواب دے گی ؟"

نسیم سے چاروں طرف کھڑی ہوئی شرم کی دیوار آہستہ آہستہ نیچی ہونے لگی۔ اُس کی پلکیں اُوپر اُٹھیں لیکن زبان اُسی طرح خاموش رہی۔

"اچھا میں تجھے مجبور نہ کروں گا سیما!" کھاٹ سے اُٹھتے ہوئے بوٹے شاہ نے کہا ــــ "تم بتانا نہیں چاہتی ہو۔"

لپک کر نسیم نے اُس کا بازو پکڑ لیا اور دوبارہ اُسی جگہ بٹھاتے ہوئے بولی ــــ

"ناراض ہو گئے بھائی جان! آپ کو میرے سر کی قسم جو گئے۔ اچھا بتاتی ہوں پوچھئے۔"

"تو بتا۔"

"کیا؟"

"یہی جو کچھ میں نے پوچھا تھا ــــ"

"ان باتوں سے میرا تعلق بھائی جان۔ آپ جانیں آپ کا کام۔"

"تیرا تعلق ان باتوں سے نہ ہوتا تو کیا میرا سر پھر گیا تھا جو تجھ سے پوچھنے بیٹھ گیا۔"

"آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں ــــ؟"

گویا بوٹے شاہ نے موضوع ہی تبدیل کر دیا ہو ــــ "میں آج تجھ سے کچھ مانگنے آیا ہوں، دے گی۔"

"میرے پاس آپ کو دینے کے لائق ہے ہی کیا بھائی جان، جو کچھ بھی ہے وہ خدا کا ہے اور آپ کا ہے۔"

"پھر مانگ لوں جو دل میں آئے ــــ"

"مانگئے نہیں، لے لیجئے اپنی چیز جو آپ لینا چاہتے ہیں ــــ"

"یہ کیلا ہے سیما؟" باہر آنگن میں لگے ہوئے آم کے ایک چھوٹے سے درخت کی طرف جو ہوا میں جھوم رہا تھا دکھا کر بوٹے شاہ نے پوچھا۔

نسیم نے آنگن کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا ___؟"

"یہ آم کا پیڑ کس نے لگایا تھا؟"

"میں نے ہی لگایا تھا بھائی جان۔"

"کیوں ___؟"

نسیم لرز اٹھی۔ گویا اس ایک لفظی سوال نے اُس کے دل میں لرزہ لگا دیا ہو، گویا اُس کی چوری پکڑی گئی، جسے وہ گذشتہ کئی سال سے اپنے دل کے کئی پردوں میں چھپائے ہوئے تھی۔ اس دفعہ پھر اُس کے چہرے کی سفیدی میں تبدیل ہو گئی۔ ماضی کی یادوں کا ایک لمبا سلسلہ اُس کی نگاہوں کے سامنے گذرنے لگا۔ ایک مرتبہ پھر اُس پر بیزاری طاری ہو گئی۔ دل کے بند دروازوں کی دراڑوں سے اُسے کوئی جھانکتا ہوا نظر آنے لگا۔ جو آہستہ آہستہ اُس کے سامنے صاف ظاہر ہو گیا۔ وہ اس وقت اپنے بچپن کی چند جھانکیاں دیکھ رہی تھی۔

•••

Makhdum Library
Kamalpura, S. N 15
Malegaon (Dist Nasik)

"سیما! ـــ" گویا کسی نے اسے نیند سے بیدار کر دیا ہو
"ارے تو کہاں کھو گئی ہے پگلی!"
"نہیں تو بھائی جان!" ـــ خواب آلودہ سی آنکھوں کو مچکاتے
ہوئے وہ بولی ـــ "سُن تو رہی ہوں بھائی جان ـــ"
"خاک سُن رہی ہے ـــ" بوڑھے شاہ خشک لہجہ میں بولا۔ اگر بتانا
نہیں چاہتی ہے تو رہنے دے ـــ" کہتے کہتے وہ پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ نسیم
نے اُسے جبراً بٹھاتے ہوئے کہا۔
"کہہ تو دیا ہے بھائی جان۔ آپ جو بھی پوچھیں گے اُس کا جواب دوں گی۔"
"تو میں نے کیا پوچھا ہے؟"
"کیا پوچھا ہے آپ نے؟"
"ارے یہی تو ـــ" اُسی طرح آم کے درخت کی طرف اشارہ
کرتے ہوئے اُس نے پوچھا ـــ "اُس آم کے بارے میں ـــ"

اور نسیم جب پھر بھی خاموش رہی تو بڑے شاہ نے بات کو طول دینا مناسب نہ سمجھا اُس نے بات کا رُخ تبدیل کر دیا۔

"کیا تو جانتی ہے کہ یوسف میرا گہرا اور بے بدل دوست ہے؟"

"کافی عرصہ سے جانتی ہوں بھائی جان۔"

"تو اُسی بے وقوف دوست کے لئے آج میں ایک چیز مانگنے آیا ہوں سیما ۔۔۔!"

"کیا بھائی جان۔"

"معافی۔"

جواب میں سیما خاموش رہی۔ تھوڑی دیر رُک کر بڑے شاہ جذبات کی رو میں بولا ۔۔۔ "جانتا ہوں سیما! وہ اول درجہ کا بے وقوف اور چھچھورا ہے لیکن دل کا برا نہیں۔ کل سے گاؤں میں آیا ہوا ہے، رات کافی دیر تک ہماری بات چیت ہوتی رہی۔ دوران گفتگو اُس نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔ اور ساتھ ہی اُس آم کی اصلیت کو بھی ظاہر کر دیا۔ کس قدر رویا تھا وہ اور اُس کے ساتھ ہی میرا دل بھی ۔۔۔"

کہتے کہتے بڑے شاہ کا گلا بھر آیا۔۔۔

"اچھا اُٹھ ۔۔۔" یکایک وہ بول اُٹھا ۔۔۔ "پہلے جا کر چراغ روشن کر، اندھیرا ہونے لگا ہے ۔۔۔"

نسیم نے حکم کی تعمیل کی ۔۔۔

اُنہیں جذبات کے زیر اثر وہ بولا ۔۔۔

جس قدر ایک بھائی اپنی بہن سے کہہ سکتا ہے۔ شاید آج میں اُس سے زیادہ کہہ گیا ہوں۔ یہ بھی نہیں بھولا ہوں کہ اُس پاجی نے تیری محبت

کو بے عزت کیا ہے، لیکن وہ اس گناہ کی پوری پوری سزا پا چکا ہے۔ جس کی بابت وہ اپنی زبان سے کچھ نہ کہے گا۔ اُسے یہاں کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ لیکن سیما وہ اس مرتبہ جو یہاں آیا ہے، تجھے حاصل کرنے کے لیے نہیں۔ کیوں کہ ایسی اُمید اب اُسے نہیں ہے۔ اب میں اس سے زیادہ اور کیا کہوں کہ اگر تو اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے نہ بچائے گی تو وہ زندہ نہ رہے گا۔ وہ بدنصیب برباد تو ہو چکا ہے۔ اب اُس کی موت ہی باقی ہے یہی سمجھ لے۔"

نسیم کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ اُس کی لمبی لمبی پلکوں پر ننھے ننھے قطرے چمک رہے تھے۔ شاید اس خوف سے کہ کہیں رونا نہ آجائے دونوں ہونٹوں کو اُس نے دانتوں تلے دبا رکھا تھا۔

بوڑھے شاہ اُٹھ کھڑا ہوا اور جانے سے پیشتر یہ اور کہتا گیا ——

"میں اس بات کا یقین دلاتا ہوں سیما! کہ اپنی کسی بھی بات کو تجھ پر جبراً لادنے کی میری قطعی کوئی راضی نہیں ہے۔ صرف یہی چاہتا ہوں کہ اگر تیری راضی ہو تو دن چڑھنے سے پہلے اپنے کنویں پر چلی جانا۔ وہیں یوسف موجود ہوگا۔ وہ تجھ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہے۔ اگر نہ جانا چاہو تو میں تجھے مجبور نہ کروں گا ——"

یہ کہتے کہتے وہ گھر سے باہر نکل گیا۔

پونم کی چاندنی رات —— ساون کا مہینہ —— بڑے اس سایہ دار درخت کے نیچے نہ جانے کتنی دیر تک گاؤں کی نوجوان لڑکیاں اور عورتیں گدھا اور جھنگرا ناچتی رہی تھیں۔

سب کے واپس آجانے پر بھی نسیم وہیں بڑے نیم سے سٹ کر کھڑی تھی کسی کے انتظار میں۔

یکایک چاندنی میں اُس نے دور سے دیکھا ایک انسانی سایہ، جو اُسی کی طرف بڑھتا چلا آرہا تھا۔ جسے دیکھتے ہی نسیم پکار اُٹھی۔

"یوسف ——!"

جواب "میں سیما" پکارتا ہوا یوسف اُس کے قریب آپہنچا۔

"کیسی ہے سیما؟"

"اللہ کا فضل ہے ——"

"کافی انتظار کرنا پڑا ——"

"نہیں تو —— سب ابھی ابھی گئی ہیں۔"

"اماں کیسی ہیں؟"

"طبیعت خراب ہی رہتی ہے۔"

"اللہ کرم کرے گا ——"

"کب لوٹے ہو راولپنڈی سے؟"

"کل ہی تو ——"

"کیا گھر آنے پر تجھے کوئی باندھ لیتا جو ملنے کے لئے کہلا بھیجا۔ کتنا لمبا ہو گیا ہے رے تو یوسف!"

"باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔

"سیما! تیرے لئے ایک چیز لایا ہوں، لے گی؟"

"دیکھوں تو کیا ہے؟"

"یہ رہا ——"

"ارے ــــ رے ــــ رے ــــ اتنا بڑا آم!"

"شہروں میں اس سے بھی بڑے بڑے آم ہوتے ہیں۔ اُسے چوسا تھوڑا ہی جاتا ہے۔"

"تو ــــ؟"

"چاقو سے کاٹ کر کھایا جاتا ہے۔ خربوزے کی طرح۔"

اور وہیں کھڑے کھڑے یوسف اس آم کو خربوزہ کی طرح کاٹنے لگا۔ لمبی سپھانکوں کی شکل میں اور نسیم کھانے لگی۔ جب گٹھلی باقی رہ گئی تو اُسے ہاتھ میں پکڑتے ہوئے بولی۔

"کیوں یوسف! اگر اسے بویا جائے تو کیا اتنے ہی بڑے آم لگیں گے؟"

"کیوں نہیں لگیں گے؟"

"تو میں اسے بوؤں گی اپنے آنگن میں ــــ"

اور گھر پہنچ کر نسیم نے راتوں رات وہ گٹھلی اپنے آنگن کے ایک گوشے میں بو دی

دو ایک دن گاؤں میں رہ کر یوسف شہر لوٹ گیا۔ اور اس کے بعد ایک طویل عرصے تک واپس نہ آیا۔ لیکن نسیم کو کبھی کبھی اُس کی بابت خبریں ملتی ہی رہتی ہیں۔

ایک روز جب نسیم نے سُنا کہ یوسف پولیس میں بھرتی ہو گیا ہے تو اُس کا دل خوف سے لرز اُٹھا۔ پولیس کے نام سے نسیم کو نفرت تھی۔ یوں بھی اُس زمانہ میں محکمہ پولیس کو ہر شخص نفرت کی نگاہ سے

دیکھتا تھا۔ اکثر یہی خیال کیا جاتا تھا کہ دس نمبر کے بدمعاش ہی پولیس میں بھرتی ہوتے ہیں۔

اس کے بعد نسیم کو کچھ اور بھی سُننے کو ملا۔ یوسف کسی چھنال عورت کے دام میں گرفتار ہو گیا ہے۔ اسی طرح کی کئی اور باتیں اُسے سننے کو ملیں نتیجہ یہ ہوا کہ نسیم کے دل میں یوسف کے لئے نفرت، غیر دلچسپی اور بے اعتمادی کے جذبات جاگ اُٹھے۔

اس وقت تک وہ گٹھلی ایک سرسبز درخت کی شکل اختیار کر چکی تھی اور اس پر بے شمار سبز اور چکنے چکنے پتوں کا گھنا پن طاری ہو گیا تھا۔

کئی مرتبہ جی چاہا کہ یوسف کی اس درد بھری یاد کی نشانی اس درخت کو کاٹ پھینکے۔ لیکن چاہتے ہوئے بھی وہ اپنی اس خواہش کو عملی شکل نہ دے پائی۔

Makhdoom Library
Kittapura, S N 15
Nuseerabad (Dist Nasik)

Makhdum Library
Kamalpura, S N 15
Malegaon (Dist Nasik)

صبح جب گاؤں کی مسجد میں "اللہ اکبر اللہ اکبر" کی آواز گونجنے لگی تب تک نسیم اپنے گھر سے نکل کر لمبے قدم رکھتی ہوئی گلی کا موڑ پار کر چکی تھی۔ اور اب اذان کا آخری حصہ "لا الٰہ الا اللہ" کی تلاوت ہو رہی تھی تو نسیم نے خود کو گاؤں کے باہر ایک سبز پگڈنڈی پر پایا۔ اذان کی شیریں آواز میں وہ اس قدر بے سدھ تھی کہ گاؤں سے لے کر کھیتوں تک کا راستہ کس طرح ختم ہوا اس کا ہوش نہ تھا اور نہ اسے یہ خبر تھی کہ اس کے پیچھے پیچھے کون چلا آ رہا ہے۔

اذان ختم ہونے پر جب پیچھے کی طرف سے اسے کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی تو اسے ایک دم جھرجھری سی آ گئی۔ اور اس نے پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھا۔ اس کے ہونٹوں سے ایک پر اطمینان آواز نکلی۔

"بھائی جان آپ ——— ؟"

بوٹے شاہ نے اُس کے برابر پہنچ کر کہا ـــــ

"میں نے سوچا شاید اکیلے میں کہیں ڈر نہ جائے ـــ"

نسیم جھجک اُٹھی ۔ کنوئیں تک کا باقی راستہ نہ تو بوٹے شاہ نے کوئی بات چیت کی اور نہ نسیم نے ہی۔ دونوں خاموشی اختیار کیے آگے پیچھے چلتے رہے۔ دونوں تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ قریب کے کھیتوں کی پگڈنڈی پر جو سہاں ندی کے کنارے کنارے چودھری فضل کریم کے کنوئیں تک چلی گئی تھی ایک سفید کپڑے پہنے کوئی انسانی سایہ نظر آیا۔ اور دو چار قدم چل کر دونوں نے پہچان لیا، وہ چودھری فضل کریم تھا۔

اصلی پگڈنڈی کو کاٹتا ہوا بوٹے شاہ ایک دوسری پگڈنڈی پر چل پڑا تاکہ چودھری اُسے دیکھ نہ لے۔ نسیم بھی اُس کے پیچھے پیچھے ہولی۔

کنوئیں کے قریب پہنچ کر بغیچے میں جب بوٹے شاہ نے یوسف کو اُس کے انتظار میں ٹہلتے دیکھا تو وہ نسیم کو یہ کہہ کر دائیں طرف مُڑ گیا۔

"میں ذرا کھیتوں میں سے ہو کر آتا ہوں۔"

کم سنی میں ہی یوسف کے سر سے اُس کے باپ کا سایہ اُٹھ گیا تھا۔ اُس کا باپ جسے "دُلّا" کہہ کر پکارا جاتا تھا، قوم کا لوہار تھا جو گولو ٹے ریلوے اسٹیشن کی شیڈ میں ملازم تھا۔ لیکن جوانی میں ہی ریلوے کے ایک حادثہ میں اُس کا ایک پاؤں کٹ گیا تھا۔ اور وہ معمولی سی پروویڈنٹ فنڈ کی رقم لے کر گھر آگیا۔ پاؤں کٹ جانے کے بعد اُسے ہاسپٹل سے ڈسچارج کر دیا گیا۔ لیکن اُس کی ہڈی میں کوئی ایسی کمی رہ گئی تھی جو آخر میں اُس کی بات

کی وجہ بن گئی۔ چند دنوں بعد یوسف کی ماں بھی اللہ کو پیاری ہو گئی۔

آخر سببِ اوقات کی فکر نے اُسے راولپنڈی پہنچا دیا، جہاں اُس نے ایک ٹانگہ ورکشاپ میں ملازمت کر لی۔

بچپن سے ہی وہ آزاد طبیعت تھا، باہر جا کر وہ اور زیادہ آزاد ہو گیا۔ لیکن وہ گاؤں سے لگاؤ ختم نہ کر سکا۔ جس کی وجہ ایک، نہیں دو تھیں ایک تو نسیم کی کشش اور دوسرے اپنے ہندو دوست بوٹے شاہ کی محبت۔

اُن دنوں پنجاب میں پولیس کی بھرتی ہو رہی تھیں۔ جن میں یوسف نے بھی اپنا نام لکھوا دیا۔ اونچے ڈیل ڈول اور تندرست ہونے کی وجہ سے اُسے بھرتی میں دیر نہ ہوئی۔

اسی دوران یوسف ایک ایسی عورت کے پھندے میں پھنس گیا جسے اُس کے شوہر نے چھوڑ دیا تھا۔ لیکن وہ چند روز بعد ہی اُسے دھتا بتا کر نہ جانے کہاں چمپت ہو گئی۔ اب اُس کی حالت دھوبی کے کتے جیسی تھی۔ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ نتیجتاً ماضی کی یادیں اُسے نئے سرے کچوکے دینے لگیں اور وہ چند روز کی چھٹی لے کر گاؤں آ پہنچا اور آتے ہی اُس نے بوٹے شاہ کو تنہائی میں بلا کر اپنے دل کا درد کہہ سنایا اور اُس سے متاثر ہو کر بوٹے شاہ نے یہ منصوبہ بندی کی۔

بوٹے شاہ اُن دونوں کے جذباتِ اُلفت سے نا آشنا نہ تھا اُس کی خواہش تھی کہ نسیم سے یوسف کی شادی ہو جائے۔ ایسی صورت میں ممکن ہے اُس کی عادتیں سدھر جائیں اُسی لیے اُس نے ایک دو مرتبہ چاچی صغراں سے بات بھی چلائی تھی۔ لیکن اُس نے ہمیشہ ایک ہی جواب دیا ـــــ "پہلا

باپو جی کی موجودگی میں میں کون ہوتی ہوں اس معاملے میں صلاح دینے والی۔ اور جب اُس نے اپنے والد کے سامنے اپنی یہ رائے پیش کی تو بندوق کی طرح سنسناتا ہوا جواب اُس کے کانوں میں گونجا۔۔۔۔ "بے وقوف! کیا میری سیما کے لیے نفنگے ہی رہ گئے ہیں"۔

بڑے شاہ کے چلے جانے کے بعد نسیم نے نگاہیں اُٹھا کر سامنے کی طرف دیکھا اور دیکھ کر متفکر ہو اُٹھی ۔۔۔ "کیا یہ وہی یوسف ہے؟" اُسے شاعر غلام رسول کی تصنیف "یوسف زلیخا" کا قصہ اُسے یاد آگیا۔ اُسے محسوس ہوا گویا اس قصے میں پڑھے ہوئے یوسف اور اس یوسف کا رنگ ڈھنگ بہت کچھ ملتا جلتا ہے ۔۔۔

نسیم کی نگاہیں ایک مرتبہ اُٹھ کر پھر جھک گئیں۔ شاید اُس کی خوبصورتی اور اُس کی مستی بھری جوانی کی چکا چوند کو برداشت نہ کر سکیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اُس کے دل میں نفرت بیدار ہو اُٹھی جو لمحہ بھر میں ہی اُس کے تمام جذبات پر طاری ہو گئی۔ اُس کے دل کی گہرائیوں سے ایک دل شکن ہوک سی اُٹھی ۔۔۔ "کاش! کبھی یہ یوسف بھی زلیخا کے یوسفؑ یعقوبؑ کے بیٹے جیسا نیک اور پاک ہوتا ۔۔۔" اور دوسری مرتبہ نسیم کی نگاہیں اُٹھیں۔ تب اُس کے کانوں نے ایک کمزور سی آواز سنی ۔۔۔ "آگئی نسیم؟"

نسیم نے کوئی جواب نہ دیا، اُس کا دل دھڑک رہا تھا اور گلا خشک ہو رہا تھا۔

"اندر آجا ۔۔۔" کہہ کر یوسف جھونپڑی میں داخل ہوا اور اُس کے پیچھے لرزتے پاؤں بادل نخواستہ نسیم بھی۔

اندر سوت کی ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی، یوسف کا اشارہ پا کر

اُس کی پٹی پر بیٹھ گئی۔

دونوں آمنے سامنے لمحہ بھر خاموش بیٹھے رہے۔ آخر یوسف نے اس خاموشی کو یہ کہہ کر ختم کیا۔ "نسیم!"

نسیم پھر بھی خاموش رہی صرف اُس کی موٹی اور پُرسکون آنکھیں جو اس وقت شکاری کے دام میں گرفتار ہرنی کی طرح خوفزدہ تھیں اوپر اُٹھیں۔ جن کی پتلیوں کی سطح پر پانی جھلک رہا تھا۔

"میرا خیال تھا تو نہ آئے گی۔" یوسف اُس کی آنکھوں میں رقصاں درد کے اثرات دیکھ کر بولا۔

"کس طرح نہ آتی۔" نسیم نے اس چھوٹے سے جملے کو کھانس کر گلا صاف کرتے ہوئے مکمل کیا۔ اس کے پیازی ہونٹ کا رنگ اس وقت نیلوفر کے پھولوں جیسا ہو رہا تھا۔ اور اُس کے دائیں ہاتھ کی اُنگلیاں اپنے سُرمئی آنچل کی کناری کو پونیاں بنانے میں مشغول تھیں، اُس کا سر جھکا ہوا تھا۔

"نسیم!" یوسف نے اپنی جگہ سے ذرا آگے کھسک کر پوچھا "ناراض ہے مجھ سے۔"

جواب میں نسیم کا سر پھر اُٹھ کر جھک گیا۔ گویا اُس کا اشارہ یوسف کے سوال کا جواب تھا جو کہہ رہا تھا۔ "اس میں کیا شک ہے۔"

"بول نسیم! تو تو منہ میں دہی جمائے بیٹھی ہے۔"

"بتائیے۔ جواب میں وہی معمولی دو لفظ ہی وہ بڑی مشکل سے زبان تک لا سکی۔ لیکن اُن کی ادائیگی میں بھی اُسے کافی مشکل کا مقابلہ کرنا۔ پُرانی روایات اور عادتوں کے مطابق اس لفظ کی ادائیگی کے شروع سے اخیر تک بولنے کے عرصہ میں ایک سوال اُس کے دل کو چھو کر گذر گیا۔

"کیا یوسف اب بھی نادان بچہ رہے ہے؟" جواسے "نبا" کہہ کر بے عزت کروں؟ جبکہ وہ خود مجھے سیما کی بجائے نسیم کے نام سے مخاطب کر رہا ہے۔"

"بتاؤں کیا نسیم؟" جھجک کے جال سے جو اُس کے چاروں طرف پھیلتا جا رہا تھا، خود کو آزاد کرتے ہوئے بولا ــــ "نسیم! میری بابت تو بہت کچھ سُن چکی ہو گی۔ اور ......"

نسیم کی نگاہیں ایک دفعہ پھر اُٹھ گئیں اور اس دفعہ جھکنے کی بجائے یوسف کے چہرے پر جم گئیں۔ ساتھ ہی اُس کے کان یوسف کی باتوں کو جلد از جلد سُننے کو بے قرار ہو اُٹھے۔

یوسف کہتا گیا ــــ "اور جو کچھ تو سُن چکی ہو اُس میں قطعی جھوٹ نہیں ہے۔ میں گنہگار ہوں۔ اللہ کی درگاہ میں بھی اور تیرے سامنے بھی۔ مجھے معاف کر دے نسیم ــــ!"

نسیم نے دیکھا یوسف کی آنکھوں میں کفارہ کی حقیقی نمی تھی۔ نسیم کا دل جو سینے سے لے کر گلے تک نفرت سے لبریز تھا۔ یوسف کی باتیں سُن کر تقریباً صاف ہو گیا لیکن جیسے ہی خودداری اور مذہبی خیالات نے کروٹ بدلی کہ دل کے صاف ہو چکے شیشے کو پھر اُس نے پہلے جیسا کسی بھاپ کی تہہ سے دھندلا کر دیا۔ اُس نے اپنے دل سے اس وقت کوئی لاوا سا اُبلتا محسوس کیا اور اس اُبال کا اثر آخر میں آواز بن کر اُس کے ہونٹوں سے پھوٹ پڑا۔

"میں کون ہوتی ہوں معاف کرنے والی ــــ!"

کہتے کہتے نسیم نے محسوس کیا گویا اُس کی آنکھوں کے دونوں کوروں میں کسی نے گرم سلائی کا سرا چھوا دیا۔ جس کی تپش سے اُس کی پتلیوں پر جمی ہوئی پانی کی تہہ پگھل کر اُس کے رخساروں تک بہہ آئی۔

"مان چاہیے نہ ہان نسیم ـــــ" یوسف نے بکھری ہوئی آواز میں کہنا
شروع کیا ـــ "قضا میرے سر پر سوار ہو گئی تھی۔ میں......."
"آپ مجھے بتائیے ـــ" اُس نے بے قرار ہو کر ٹوکا ـــ "کس لئے
بلایا تھا مجھے۔ جلدی کرو۔ گھر کا سارا کام پڑا ہے کرنے کے لئے۔"
"میں نے بلایا تھا، تجھے پہلا پیار یاد دلانے کے لئے۔"
"نسیم کا دل بوکھلا اُٹھا اُس کا ڈھیٹ پن دیکھ کر۔ وہ سوچ رہی تھی ـــ
"اس قدر بے غیرت ہے یہ کہ اپنی محبت کو کچل مسل کر پھینک دینے کے
بعد بھی مجھے میری محبت یاد دلانے کے لئے آیا ہے ـــ" غصے سے نسیم کے
پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ اُس کا جی چاہا کہ اسی لمحہ اُٹھ کر یہاں سے دوڑ جائے۔ لیکن
دل کا بوجھ ہلکا کئے بغیر اُس کے لئے اُٹھنا مشکل ہو رہا تھا۔ اُس کا غصہ
آگ کے شعلوں کی طرح اس جملے کی شکل میں بھڑکا۔
"کونسا پیار ـــ؟"
"بھول گئی ہے نسیم؟"
"شرم نہیں آتی ہوگی پوچھتے ہوئے؟ سچ کہتے ہیں آدمی ڈھیٹ
ہونا چاہیئے۔ شرم تو آنی جانی ہے ـــ"
یوسف کا دل اُس کاری ضرب کو بڑی مشکل سے برداشت کر سکا۔
اُس کی قدرتی سختی پکار اُٹھی۔ "بے نگاتے ٹکڑوں پہ پلنے والی ایک چھوکری
کی یہ مجال۔" لیکن اندرونی تلخی کو اندر ہی اندر پیتے ہوئے اور اپنی آواز میں
بہت زیادہ نرمی اور معمولی سی گرمی شامل کر کے بولا ـــ "نسیم گذری باتیں
بھول جا۔ میری کرنی نے مجھے پہلے ہی کافی بے عزت کر رکھا ہے ـــ"
"لیکن آپ کی کرنی کی تو میں ذمہ دار نہیں ہوں۔" نسیم نے اُسی طرح

دھڑکتی آواز میں جواب دیا۔
"نسیم!" وہ پھر گڑگڑایا۔ "دیکھ میری دُنیا برباد نہ کر۔"
"میں کیوں کر کروں گی، جو کسی کی دُنیا برباد کرے، اللہ تعالیٰ اُس کی دُنیا برباد کر دیتے۔"
"یوسف کی خودداری ایک دفعہ پھر بیدار ہو اُٹھی — تجھے شرم تو نہیں آتی ارے او بے غیرت! ایک لڑکی سے بے عزت ہوتے ہوئے لیکن اُمید کی ڈوری بہت سی لڑیاں ٹوٹ جانے پر بھی۔ ابھی ایک آدھ لڑی باقی تھی۔ جس نے خودداری کی للکار کو صبر کے دھکے کے ساتھ پیچھے کی طرف دھکیل دیا —
"نسیم! تجھے ماں کا دودھ حرام جو میں کبھی تیرے سامنے بے وفائی کروں ایک دفعہ تو......"
"اس قسم کی قسموں کی میرے سامنے کوئی قیمت نہیں ہے —" نسیم نے لاپروائی سے دوسری طرف منہ پھیرتے ہوئے کہا۔
"میں قرآن کے تیس پاروں کی قسم کھا کر کہتا ہوں نسیم —!"
"جھوٹی قسمیں کھانے والے پر خدا کا قہر نازل ہوتا ہے —" نسیم کی آواز میں قطعی نرمی نہ آئی۔
"نسیم —!!" اس مرتبہ یوسف کو اپنی برداشت کی طاقت بے قابو ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اُس کی کڑکتی ہوئی آواز سے خوفزدہ ہو کر نسیم نے اُس کی طرف دیکھا۔ یوسف کی آنکھوں میں وحشت اور ہوس ناچ رہی تھی جن سے سہم کر اور کچھ کھینچ کر دہ کھاٹ سے اُٹھی اور جانے کے لئے تیار ہوئی اُس کی آنکھوں میں اس وقت نسوانیت کی مکمل خودداری رقصاں ہو اٹھی تھی

"لیکن وہ دو قدم سے زیادہ نہ بڑھ سکی۔ یوسف نے بڑھ کر تیزی سے اُس کا بازو تھام لیا۔ اور یہ کہتے ہوئے پھر چارپائی کی طرف کھینچ لایا۔" دیکھ نسیم! اس قدر غرور اچھا نہیں ہوتا۔ ذرا بیٹھ جا اور ایک دو باتیں میرے ساتھ کرکے جا ..."

سخت اور مضبوط ہاتھ کی کمپڑنے اور اُنگلیوں کی کڑی جکڑ نے نسیم کے تمام جسم کو لرزا دیا۔ اُسے ابھی سے کسی آنے والے خطرے کا احساس ہونے لگا۔ لیکن پھر بھی وہ اڑی نہیں، یوسف نے اُسے چارپائی لاکر بٹھا دیا بیٹھ گئی۔

"نسیم! ..." یوسف اپنے غصہ کی تلخی میں نرمی کی شکر ملا کر بولا۔

"میں نے تمہیں بلایا تھا زخموں پر مرہم لگانے کے لیئے۔ اگر تو نے ان زخموں پر نمک ہی چھڑکنا تھا تو کیا ضرورت تھی آنے کی؟"

نسیم جھکی ... "ضرورت تھی یا نہیں۔ اپنے بھائی کے حکم سے عدولی میں نہیں کر سکتی تھی۔"

حقارت کی اس قدر زبردست چوٹ، یوسف تلملا گیا ... وہ بھول گیا کہ کیا کہنے کے لیئے اُس نے دوبارہ نسیم کو کھینچا ہے۔ اُس کی مرضی کے خلاف۔ شاید خود بخود اُس کی زبان سے نکلا۔

"بھائی! کون تیرا بھائی ...؟"

"جس کے ہاتھوں آپ نے پیغام بھیجا تھا۔"

حسد اور ہوس کے زیر اثر یوسف اپنے گہرے دوست کی دوستی فراموش کر بیٹھا۔ گرج کر بولا ... "وہ تیرا بھائی کس رشتے سے ہے ...؟"

"جس رشتے سے عزیز میرا بھائی ہے ..."

نسیم کے اس جواب نے یوسف کے بجھے ہوئے دل پر ایک اور کوئلہ رکھ دیا ....

اب اُس کی حالت یہ تھی کہ اُس نے اپنے غصے کی جنگاریوں کو سمیٹ کر کسی قدر روکے رکھا تھا وہ تمام نسیم کے اس جواب سے بکھر گئیں۔۔۔۔

"کیوں نہیں، ہندو تیرا بھائی ہو گیا اور ہم مذہب بیگانے ہیں۔"

نسیم شیرنی کی طرح دہاڑ کر بولی ۔۔۔ "بھائی جان کی شان میں کچھ کہا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہو گا۔"

"کیا کہنے میں بڑی آئی ہے چہیتی بھائی کی ۔۔۔" کہتے کہتے یوسف کا تمام جسم غصہ سے لرز اُٹھا۔

"میں کہتی ہوں تہذیب کی حد کو پار نہ کیجئے۔ وہ نہ کہتے تو میں یہاں تھوکنے بھی نہ آتی ۔۔۔"

"میں کہتا ہوں آگے نہ بڑھ ٹوٹی جوتی کی طرح، اتنی حور پری جیسی رہ گئی ہو تو کہ اتنا گمان ہو رہا ہے تجھے ۔۔۔"

"حور اور پریاں گاؤں میں نہیں ملتیں۔ شہر کے چوباروں میں رہتی ہیں ۔۔۔ وہاں جا کر تلاش کر۔"

"چُپ رہ گدھی ۔۔۔"

"گدھی ہو گی تیری ۔۔۔۔۔۔"

اُس سے اگلا لفظ "ماں" نسیم کے ہونٹوں میں ہی تھا کہ ایک بھاری ہاتھ کا کڑاکڑ اتا ہوا چانٹا اُس کے گال پر پڑا۔ نسیم کا سر چکرانے لگا۔ اور اُس کی آنکھوں کے آگے تاریکی ناچ اُٹھی۔ اُس نے اپنے جسم کو یوسف کے بازوؤں کی گرفت میں دیکھا۔

مکوں، ناخنوں اور تھپڑوں کی مدد سے اُس نے کافی کوشش کی خود کو آزاد کرنے کی۔ لیکن سانپ کے مُنہ میں جکڑی چڑیا کی طرح چھٹپٹا کے چیخنے چلانے

علاوہ کچھ نہ کر سکی۔

"حرام زادی، کم ذات، خنزیر کی تخم ــــــ....." ایک سانس میں کہتا ہوا یوسف جبراً اُس کا مُنہ چومنے کی کوشش کرنے لگا کہ اُس نے دروازے پر کسی کے قدموں کی آواز سُنی۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ جس سے فائدہ اُٹھا کر نسیم نے ایک ہی جھٹکے سے خود کو آزاد کر لیا۔ اور بغیر یہ خیال کئے کہ دروازے میں کون کھڑا ہے۔ جھونپڑی سے نکل کر پیچھے سے باہر ہو گئی۔

"کیوں رے حرام کے پلّے!" دروازے میں کھڑا نوجوان اللہ دتا چیتے کی طرح چھلانگ مار کر یوسف پر جھپٹا۔

حالانکہ یوسف کو اپنی جوانی کا بڑا غرور تھا اور اُس کا قد اللہ دتے کے قد سے ذرا اونچا بھی تھا۔ لیکن اللہ دتے کا جسم بھی لوہے کی طرح سخت تھا۔ اُس نے پہلے وار میں ہی یوسف کا گلا پکڑ کر جھونپڑے سے دھکیلتے ہوئے کہا ــــــ

"آ بدبخت! تجھے بتاؤں، پرائی بہو بیٹیوں کو چھیڑنے کا مزا ــــــ"

"چل بے چل ــــــ" یوسف اپنی کھونٹی دار مونچھ کو مروڑ دیتے ہوئے ہنکارا ــــــ "کہیں بتیسی باہر نہ ہو جائے۔"

"ہوں" قمیص کی آستینیں چڑھاتا ہوا اللہ دتا پھر للکارا ــــــ "آ پھر کر لیں دو دو ہاتھ، تیری آج تک کسی اُستاد سے ٹکر نہیں ہوئی اور میں نے بھی تیری چالوں کو دیکھ دیکھ کر ــــــ اور جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی دونوں گتھم گتھا ہو گئے ــــــ

"یوسف کو خواب میں بھی خیال نہ تھا کہ وہ پستہ قد شخص اُسے لمحہ بھر میں کچل کر رکھ دے گا ــــــ جب کپڑے پھڑوا کر اور گھونسوں سے مُنہ اور

پیشانی نیلا لال کرانے کے بعد اُس نے اللہ دتہ کے فولادی بازوؤں سے نجات حاصل کی تو اُس کی نگاہیں زمین پر گڑی ہوئی تھیں۔

کیڑے سے تمہارا ناس ہو اللہ دتا زور سے کڑکا ۔۔۔ چلا جا یہاں سے مُنہ کالا کر کے حرامی کے پلّے پھر جو تجھے گاؤں میں دیکھا تو یاد رکھو سپاہی گیر گھسیٹ دوں گا ساری۔ کتیا سے تخم! شرم نہ آئی تجھے گاؤں کی لڑکی پر ہاتھ اُٹھاتے ہوئے۔ بیٹیا اگر گاؤں میں آیا تو پنچایت میں بٹھا کر مُنہ تیرا کالا نہ کیا تو مجھے ماں نے نہیں کتی نے جنا ہے۔۔۔"

"اللہ دتے ۔۔۔!" دانتوں سے بہتے خون کو پگڑی کے پلو سے پونچھتے اور ہانپتے ہوئے یوسف گڑگڑایا ۔۔۔ "بھائی جان مجھے معاف کر دو مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔"

"غلطی ہوئی ہے تجھ سے۔" مُنہ چڑا کر اللہ دتا بولا ۔۔۔ "غلطی نہیں یہ تیری ہر روز کی عادتیں ہیں، بیٹا آج کوئی نئی بات تو نہیں ہوئی۔"

"اچھا بھائی ۔۔۔!" پہلے کی بہ نسبت اور بھی نرمی اختیار کر کے وہ بولا ۔۔۔ "اس دفعہ میری عزت بچا لے۔ گاؤں میں کسی سے ذکر نہ کرنا ۔۔۔ اگر پھر ایسی بات دیکھے تو چور کی جو سزا دے میری سزا۔

"گاؤں میں ذکر نہ کروں؟" اللہ دتا اسی رعب سے کڑکا ۔۔۔ اور جس بے چاری کی بے عزتی تو نے کی ہے وہ کیا کہے گی؟ کیا مر گئے ہیں گاؤں والے سبھی؟ اگر اپنی خیریت چاہتا ہے تو چپ چاپ چلا جا باہر ہی باہر راولپنڈی کی طرف ۔۔۔ بس میں نے سو کی ایک بات بتا دی ہے گاؤں میں پاؤں رکھا تو ہڈی بوٹی ایک کر ڈالوں گا تیری ۔۔۔"

اور پھر یوسف سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔

Makhdum Library
Kamalpura, S N 15
Malegaon (Dist Nasik)

یہ تو محض بہانہ تھا کھیتوں کو دیکھنے کیلئے جانے کا در اصل بوڑھے شاہ کی خواہش تھی اُن دونوں کی ملاقات کرانے کی جس سے وہ تنہائی میں کھلے دل سے باتیں کر سکیں۔

کچھ دیر اُدھر اُدھر ٹہلنے کے بعد وہ وہیں لوٹ آیا۔ اُسے یقین تھا کہ اب تک اُن دونوں کی گفتگو ختم ہو چکی ہوگی۔ لیکن وہاں اُسے جھونپڑی میں ایک ایسی چیز نظر آئی جس پر نگاہ پڑتے ہی اُس کی آنکھوں میں سرسوں پھول اُٹھی۔ گویا کسی نے اُس کے سینے میں بھالا بھونک دیا ہو۔ اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے کانچ کی چوڑیوں کے چند ٹکڑے جنہیں پہچاننے میں اُسے دیر نہ لگی۔ بنگنی رنگ کی چوڑیاں اکثر نسیم کی کلائیوں میں اُسے نظر آیا کرتی تھیں۔

سر پکڑ کر وہ وہیں بیٹھ گیا۔ کسی خوفناک حادثہ کے خیال سے وہ لرز اُٹھا۔ بے شمار شکوک اُس کے ذہن میں آندھی کی طرح گھر اُٹھے۔

وہ اُٹھ کر گاؤں کی طرف بھاگا اور گھر جاکر اُس نے جو کچھ دیکھا اُسے ہم پیشتر دیکھ چکے ہیں، اپنے والد سے لاٹھی کا وار برداشت کرنے کے بعد دل کی کوئی بھی بات اُس نے پنچوں سے نہ چھپائی۔ اور دوست کی شکل میں دشمن کی بابت سب کچھ سچ سچ بیان کر دیا۔

اُس وقت تک اُسے اس معاملہ کی بابت اس سے زیادہ واقفیت نہ تھی نہ بےچاری نسیم کے ساتھ کیا گذری، بعد میں اللہ دتا سے تفصیل سارا حال معلوم ہونے پر اُسے کچھ اطمینان ہوا، دل ہی دل میں بھگوان کا شکر ادا کیا کہ معاملہ چھینا جھپٹی سے آگے نہیں بڑھا۔ اُس کی دھرم کی بہن کی آبرو بچ گئی۔

اُس کا جی چاہا کہ جلد از جلد نسیم کے گھر جائے۔ لیکن اُس کا باپ اُس سے پہلے وہاں جا پہنچا تھا اس لئے اُس نے وہاں جانے کا اپنا خیال دوسرے روز کیلئے ملتوی کر دیا۔

دوسرے روز جب نسیم سے اُس کی ملاقات ہوئی تو جھجک، افسوس اور شرم کی وجہ سے اُس کے سامنے حلق سے آواز نکالنی مشکل ہو گئی بڑی مشکل سے اُس کی زبان سے نکلا ـــــ

”سیما! مجھے معاف نہیں کرو گی۔ اس میں میری ہی غلطی تھی تجھے میں نے ہی اُس درندے کے پاس جانے کے لئے کہا تھا۔ میں بہت رنجیدہ ہوں سیما! ـــــ“ کہتے کہتے اُس کا گلا بھر آیا۔

نسیم نے جیوں ہی اُس کی آنکھوں میں نمی دیکھی تو بھائی کی محبت بھی بے قابو ہو گئی۔ وہ اپنی جگہ سے کھسکی اور بوٹے شاہ کے کندھے ہاتھوں سے نیچے کی طرف دباتی ہوئی بولی ـــــ

"بھلا اس میں آپکا کیا قصور ہے؟ کیا آپ میرے دشمن تھے؟"

"بہن سیما۔۔۔! " اُس کی طرف نظریں اُٹھائے بغیر ہی دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے بوٹے شاہ نے کہا۔۔۔ "میں نہیں جانتا تھا کہ اُس کمینے نے ......"

شرم اور تہذیب نے اُس کی زبان روک دی۔

"اس طرح دل چھوٹا نہیں کرتے بھائی جان۔۔۔!" نسیم کا ایک ہاتھ اُس کے کندھے پر تھا۔۔۔ "میں نہیں بولوں گی آپ سے اگر آپ نے ایسی باتیں کرنی ہیں۔۔۔"

معلوم ہوتا تھا ابھی بوٹے شاہ کے دل کا بوجھ ہلکا نہیں ہوا۔ جسے ہلکا کرنے کے لیئے آج نسیم کے پاس آیا تھا۔ اُس کا دل برابر لعنت دے رہا تھا۔۔۔"

"آپ نہ مانیں گے بھائی جان۔۔۔!" نسیم نے بوٹے شاہ کے چہرے کے اثرات میں کوئی فرق نہ آتا دیکھ کر دُکھی ہو کر کہا۔۔۔ "میرا دل توڑنے لگے ہیں۔۔۔!"

اس پر بوٹے شاہ کی نظریں اوپر اُٹھیں اور نسیم کی آنکھوں میں جم گئیں گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہی ہوں۔۔۔ "نسیم! میں تیرا دل توڑوں گا؟ جو تیرے دل کو جوڑنے کی فکر میں گھُل رہا ہے۔"

اُسی طرح نسیم کی آنکھیں جو آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اُن کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔۔۔ "سیما! تیرا دل کس قدر وسیع ہے۔ کوئی بھی بہن مجھ جیسے بے وقوف بھائی کو معاف نہیں کر سکتی۔۔۔" اور اُس کا دایاں ہاتھ خود بخود اُٹھ کر نسیم کا سر سہلانے لگا۔

اب تک صغرا صحن ہی میں جھاڑو لگانے میں مشغول تھی۔ اندر آتے ہی بولی ___

"آج بہن بھائیوں میں کونسی سنجیدہ گفتگو ہو رہی ہے؟" اور دونوں کی آنکھیں پُرنم دیکھ کر معاملے کو تقریباً سمجھ گئی۔

"کچھ نہیں چاچی ___!" بوٹے شاہ نے نسیم کی طرف سے توجہ ہٹا کر اس کی طرف دیکھا ___ "کل کی بات کر رہا تھا۔ سیما کو کہنے آیا ہوں کہ کوئی بات دل پر نہ لگائے۔ جو جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔"

صغرا کے سوکھے ہوئے پیلے چہرے پر اندر کی طرف دھنسی ہوئی آنکھیں، جن کے باہر سیاہ جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس طرح تھرکیں جس طرح چوزوں والی مرغی چیل جھپٹنے کے خوف سے لرز اُٹھتی ہے اس کی کمزور گردن پر اُبھری ہوئی نیلی رگیں اور زیادہ صاف ہو اُٹھیں اور ایک سرد سانس لیکر بولی ___

"بیٹے! کیا پوچھتا ہے، ساری رات آنکھ پھوٹ جائے جو لگی ہو۔ اللہ نے یہ دن بھی دکھانا تھا۔ اتنی عمر گذر گئی گاؤں میں رہتے ہوئے آج تک کبھی نے کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ معلوم نہیں زمانے پر کیا آفت آئی ہے۔ اللہ کرے اس نامراد کو، جوانی لوٹنے کو یہ بھی خیال نہ ہوا کہ ......"

بات کاٹ کر بوٹے شاہ بولا ___ "اچھا چاچی! بھول جا اب ان تمام باتوں کو۔ ارمان ایک ہی ہے کہ وہ قابو نہیں آیا۔ ورنہ دیکھتیں کیسے جیسا بدحال کرتا ___ اس کی قسمت اچھی تھی جو بچکر نکل گیا ___"

"دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو بیٹیا ___" پُرجذبات ہو کر صغرا نے

کہا —— "اللہ کی مہر اور تمہاری برکت کا صدقہ ہے، ورنہ میرے جیسی سر پھرے بہن کی بات کس نے پوچھنی تھی۔ سب کچھ سن چکی ہوں، خدا تمہاری عمر دراز کرے۔ جب تک باپو جی کا اور تمہارا سایہ سر پر ہے ہمیں کس بات کی فکر۔ آج کل تو کسی کسے رشتہ دار اور اپنے کبھی نہیں پوچھتے۔ خدا مجھے اور میرے ان دونوں معصوم بچوں کے نصیب کو تمہارے سایے تلے لے آیا۔ ورنہ ...."

"چھوڑ چاچی ——!" بوٹے شاہ کو یہ باتیں پسند نہ آئیں —— کیا لے بیٹھی ہے، یہ بھی کوئی کہنے والی باتیں ہیں۔ کرشنا بہن کا انتقال نہ ہوتا تو شاید اتنا موہ نہ ہوتا سیما سے۔۔ اب تو سچ کہتا ہوں چاچی، کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ بھگوان نے کرشنا کے بدلے میں مجھے سیما دیدی ہے۔ باپو جی بھی جب کبھی ذکر ہوتا ہے کہتے ہیں، کرشنا بھی اسی جیسی بھولی بھالی تھی۔"

صغرا سارا درد و غم بھول گئی۔ بولی —— "جیتا رہے! اللہ میاں تجھے سلامت رکھے، کرشنا سے میرا کم موہ تھا؟ اس قدر ہونہار لڑکی کسی نے کہیں دیکھی تھی؟ چند دنوں میں ہی ایسی نظر آنے لگی تھی گویا پریوں کے ملک سے آئی ہو۔ دل دیکھ دیکھ کر نہ بھرتا تھا۔ اللہ میاں اگر عمر کا دھاگا نہ کٹتا تو آج میری کرشنا سنبھالے نہ سنبھلتی، پر بیٹے! مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جا سکتا —— سیما پہلے آپ کی اور پھر میری ہے۔ خیر جو ہو سو ہو گیا۔ لیکن ایک بات سمجھا دے اپنی بہن کو کہ اکیلی دکیلی کھیتوں میں نہ جایا کرے، جانا بھی ہو تو سنگ ساتھ لے کر جایا کرے۔ دیکھ بیٹے آج کل پہلے جیسا زمانہ نہیں رہا۔ گاؤں ہمارا اچھا بھی دوسرے گاؤں سے

اچھا ہے لیکن دانشمندوں نے کہا ہے۔ "من کا بھایا کھایا جائے" ار
جگ کا بھایا پہنا جائے۔ کیوں۔ لوگوں کے ذکر کا ذریعہ نہیں ہم؟"

"یہ بات درست ہے چاچی تیری ۔۔۔" پھر اُس نے نسیم کی طرف
دیکھ کر کہا ۔۔۔ "اکیلے آنے جانے کی ضرورت ہی کیا ہے سیما۔
آس پاس کوئی ساتھ نہ ملے تو اپنی بھابھی کو ساتھ لے کر جایا کرے۔
دروازہ کے ساتھ دروازہ ہے۔ آواز دینے پر پہنچ جاتی ہے۔ کونسا
زیادہ دور ہے ۔۔۔؟"

"نسیم نے خاموش رہ کر عزت آمیز نگاہوں سے اُس کی طرف
دیکھا۔ اُس کی نظریں احسان کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھیں۔

آتے وقت بوٹے شاہ کے دل پر جو ناقابل برداشت بوجھ تھا
واپسی میں تمام ہٹ چکا تھا۔

Makhdum Library
★ Kamalpura, S N 15
Malegaon (Dist Nasik) ★

Makhdum Library
★ Kamalpura, S. N. 15 ★
Malegaon (Dist. Nasik)

اِس واقعہ کے چار پانچ روز کے بعد بوٹے شاہ کو یوسف کا ایک لفافہ مِلا۔ اس میں دو خط تھے۔ ایک اُس کے نام اور دوسرا نسیم کے نام۔

دونوں کو پڑھنے کے بعد بوٹے شاہ کے دل میں دو مختلف خیالات میں کشمکش شروع ہو گئی۔ گذشتہ کئی دنوں سے یوسف کے لئے اُس کے دل و دماغ میں نفرت کا لاوا اُبل رہا تھا۔ لیکن ان خطوں کو پڑھ کر اُس پر دوسرا ہی اثر ہوا۔

اُس روز اگر یوسف باہر ہی باہر راولپنڈی نہ چلا گیا ہوتا تو ممکن تھا کہ دونوں میں ہاتھا پائی کی نوبت آجاتی۔ لیکن ان لمبے چوڑے پانچ چھ کاغذوں نے دھدھکتی ہوئی آگ پر پانچ چھ گھڑے پانی چھڑک دیا یہاں تک کہ اُنہیں پڑھتے پڑھتے اُس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ دل کی گہرائیوں سے ایک سرد آہ کے ساتھ نکلا ——

"آہ بدنصیب یوسف — !"

نسیم کے نام آئے خط کو اُسے دینے سے پیشتر اُس نے ا
کو دکھانا مناسب سمجھا۔ اُسے خوف تھا کہ کہیں پہلے جیسا حادثہ نہ ہو
جائے —

خط پڑھ کر باباجی نے کافی غور کے بعد جب اُسے نسیم تک پہنچانے
کی اجازت دیدی تو بوٹے شاہ وہاں جاکر اور چپکے سے خط نسیم کو دے
لوٹ آیا۔ نسیم کے روکنے پر بھی وہ نہ رُکا۔

تنہائی میں بیٹھ کر نسیم نے اُسے پڑھنا شروع کیا۔ تقریباً دو تین کا
غذ تھے اور، دونوں طرف لکھے ہوئے تھے۔ پڑھنے کے بعد پسینے سے گور
چہرے پر پسینہ چمک گیا۔ اُس کی آنکھ کی پتلیوں پر جمی ہوئی پانی کی پر
دو دھاروں میں تقسیم ہوکر بہنے لگیں اور اُس کی دھندلی نظریں بار
ان الفاظ کو دوہرانے لگیں۔

"نسیم! تم نے اُس روز کہا تھا —" میں تمہاری شکل
نہیں دیکھنا چاہتی۔ اللہ تعالےٰ نے چاہا۔ تیری یہ مُراد بر
آئے گی۔ اب تم میری شکل کبھی نہ دیکھو گی — لیکن ایک
ہی ارمان رہ گیا ہے نسیم۔ اگر تم نے مجھے معاف نہ کیا۔ تو
میری روح قبر میں جاکر تڑپتی رہے گی۔ میں جانتا ہوں کہ میرا
گناہ ایسا نہیں جسے تو بخش سکے۔ مگر اس بات سے بھی انجان
نہیں ہوں کہ تیرا دل کس قدر وسیع ہے، تو نے مجھے کتنی مرتبہ
معاف کیا ہے۔ میرا خیال ہے جو انسان کسی کے چھوٹے چھوٹے
سینکڑوں گناہوں کو معاف کرسکتا ہے اُس کے لئے ایک

جا اگناہ معاف کرسکتا مشکل نہیں ....."

وہ اسی طرح خط پڑھتی گئی اور پڑھ کر بہتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھتی گئی۔

اور جب وہ باہر صحن میں نکلی تو اُسے محسوس ہوا کہ گویا اُس کے دل کا ایک بوجھ ہٹ گیا ہے۔ اور اُس کی جگہ ایک دوسرا بوجھ جو پہلے کی بہ نسبت کہیں زیادہ وزنی ہے لد گیا ہے۔ یوسف کے لئے نفرت کا کوئی جذبہ اُس کے دل میں نہ رہا۔ بلکہ اُس کی جگہ ہمدردی نے لی تھی۔ بجھی ہوئی محبت کی چنگاری پھر نئے سرے سے سلگ کر اُس کے سوئے ہوئے جذبات کو بیدار کر رہی تھی لیکن ساتھ ہی جس نئے بوجھ تلے اُس نے اپنے دل کو لپٹتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ تھی یوسف کی زندگی کی فکر۔ رہ رہ کر خط کے یہ الفاظ اُس کے دل میں سوراخ کر رہے تھے ۔۔۔ "تو میری شکل کبھی نہ دیکھے گی۔ قبر میں بھی میری روح تڑپتی رہے گی ۔۔۔"

تو کیا واقعی یوسف کچھ کرنے کیلئے آمادہ ہے؟ کہیں زندگی پر کھیل نہ جائے ۔۔۔؟ ہے تو ایسا ہی دیوانہ ۔۔۔ مگر ۔۔۔ مگر ۔۔۔ ... اس کے آگے وہ کچھ بھی نہ سوچ سکی۔ لیکن ایک ہلکی سی ٹیس اسے اپنے دل کی گہرائیوں میں انگڑائی لیتی ہوئی محسوس ہوئی ۔۔۔ اگر ایک آدھ خط اُسے لکھ کر بھیج دوں تو ۔۔۔؟ لیکن فوراً ہی وہ "اونہوں" کہہ کر باہری دروازے کی طرف مڑ گئی ۔۔۔ دروازے کی طرف آتے ہوئے سب سے پہلے اُس کی نگاہ جس چیز پر پڑی وہ تھا آم کا درخت۔ جس کی طرف گذشتہ کئی دنوں سے اُس نے توجہ نہ دی تھی۔

وہ چیونٹی کی چال چلتی ہوئی اُس درخت کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔
اُسے محسوس ہوا کہ گویا اس ایک ہی ہفتہ میں درخت کی جوانی بڑھاپے میں تبدیل ہو گئی ہے۔ حالاں کہ پتوں کی زردی اور مُرجھانے کی وجہ پت جھڑ کی تیز ہوا تھی لیکن نسیم نے محسوس کیا گویا یہ سب کچھ اُس کی اپنی لاپرواہی سے ہوا ہے۔

اُس نے پانی کا ایک گھڑا لا کر درخت کی جڑوں پر اُنڈیل دیا۔ لیکن اس کے باوجود اُس کے دل کا درد کم نہ ہوا۔ اُس کے خیالات کی روانی بدستور اُسی سمت رہی جس سمت وہ اُسے موڑنے کی کوشش کر رہی تھی اور یہ روانی اُس وقت تک رہی جب تک کہ اُس نے کاغذ اور قلم دوات لے کر خط کا جواب لکھنا شروع نہ کر دیا۔

کھانے پینے سے فرصت پا کر صغرا سو چکی تھی۔ نسیم کو اور کوئی کام تھا نہیں۔ بس اب خط تھا یا نسیم تھی۔

خط لکھتے لکھتے نسیم کو اس بات کا قطعی خیال نہ آیا کہ وہ اُسے بھیجے گی کس طرح؟ خط لکھنے کے بعد اُسے اس بات کی فکر پیدا ہوئی تو وہ بے حد گھبرا گئی۔ یوسف کا پتہ اُسے معلوم نہ تھا۔ شاید یوسف نے جان بوجھ کر خط میں اپنا پتہ تحریر نہیں کیا تھا۔ یا شاید وہ خط کا جواب بوٹے شاہ کے ذریعہ ہی منگوانا چاہتا ہو۔ کیا یہ خط بوٹے شاہ کے ہاتھ میں دیا جا سکتا ہے —؟

اس خیال نے نسیم کو شرم سے پانی پانی کر دیا۔

آخر اُس نے دونوں خط کپڑوں کے ٹرنک میں رکھ دیے۔ رات کا ایک بڑا حصہ انھیں خیالات میں کھوئے کھوئے گذر گیا کہ خط بھیجے تو کس طرح؟

اگر نہ بھیجا تو ہو سکتا ہے کہ یوسف کچھ اور نہ کر بیٹھے۔

رات گذری، دوسرا دن چڑھا۔ تو بھی نسیم کے دل پر رات کی بے آرامی سوار تھی۔ یوسف کو کسی انجانے خطرے سے بچانے کے لئے جواب دینا ضروری تھا۔ لیکن اُس کے ساتھ ہی ایک اور وجہ بھی تھی اُس کی بے چینی کی۔ ان کاغذوں میں نسیم کی اپنی سچی محبت کا یقین تھا اور یہ بھی اُمید تھی کہ یوسف کو شریکِ حیات پا کر وہ خود کو خوش بخت سمجھتی اگر یوسف خود کو حقیقت میں " یوسف " (یعقوب کا بیٹا) جیسا پاک اور معصوم بنا پاتا۔

خط کے ان کاغذوں میں نسیم نے اپنے دل کی تمام محبت، ارمان مستقبل کی تمام اُمیدیں سوٹ کیس میں بند رکھنے کے لیے بھر دی تھیں لیکن اس کا کیا ذریعہ ــــ ؟ کیا وہ بوڑھے شاہ سے یوسف کا پتہ پوچھ لے؟ لیکن یہ تو سخت بے عزتی ہوگی اُس کے بھائی جان کی۔ وہ سوچیں گے شاید نسیم کو اُس پر بھروسہ نہیں جو چھپا کر خط لکھنا چاہتی ہے ــــ

صبح سے دوپہر تک وہ انہیں خیالات میں اُلجھی رہی۔ خط جب تک ڈاک میں نہ ڈال دیا جائے۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا گویا اُس کے دل پر ہزاروں من بوجھ لدا رہے گا۔

دوپہر کے کھانے پکانے سے فرصت پا کر نسیم اندر جا بیٹھی صغرا کئی دنوں کے بعد رکمن سے ملنے اُس کے گھر گئی ہوئی تھی۔ اس وقت نسیم اپنی چارپائی پر بیٹھی، یوسف والا خط پڑھ رہی تھی۔ اور اس کے بعد اسکے جواب میں لکھے اپنے خط کو لے کر بیٹھ گئی۔ جس کے ہر لفظ کو وہ نقاد کی حیثیت سے پڑھنے لگی۔ شاید اس میں کوئی لفظ ایسا ہو کہ جس سے یوسف

کے دل کو ٹھیس لگے۔ جبکہ وہ پہلے ہی بیچارہ ناامیدی کے گہرے سمندر میں
غوطے لگا رہا ہوگا۔

خط کے نصف صفحات ہی وہ پڑھ سکی ہوگی کہ باہر سے آواز آئی
"سیما ـــــ"

اُس نے تیزی سے خط بستر کے نیچے چھپاتے ہوئے جواب دیا
"آئی بھائی جان ـــــ!"

باہر آکر اُس نے دیکھا ـــــ بوٹے شاہ بیٹھک میں کھڑا تھا۔
چارپائی پر بیٹھ جانے کے لئے نسیم نے بہت کہا۔ لیکن وہ کھڑے
کھڑے ہی بولا۔

"بیٹھنے کا وقت نہیں ہے، ایک ضروری کام سے لتی فالا جا رہا
ہوں۔ صرف باپو جی کا ایک پیغام تجھے دینے آیا ہوں۔"

"کہئے بھائی جان ـــــ!"

"اُنہوں نے کہا ہے کہ اس خط کا جواب یوسف کو نہ بھیجنا۔"
سُن کر نسیم کی جان نکل گئی۔ وہ جاننا چاہتی تھی "کیوں"۔ لیکن پوچھ
نہ سکی۔ شاید بوٹے شاہ بھی سمجھ گیا کہ نسیم اس پابندی کی وجہ سُننے کے
لئے بے قرار ہے اُس نے خود ہی بتانا شروع کر دیا۔

"یہ تو میں نے تمہیں بتا ہی دیا تھا کہ تمہارے خط کو میں نے باپوجی کو پڑھ کر
اور اُس کی اجازت حاصل کر کے ہی تمہیں دیا تھا۔ پتہ نہیں رات ہی رات
میں اُنہوں نے کیا سوچا۔ صبح اُٹھتے ہی کہنے لگے ـــــ "بوٹے! سیما
سے کہہ دے جا کر کہ خط کا جواب نہ دے ـــــ"

اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے بوٹے شاہ کہتا گیا۔ "سُن کر

مجھے سخت حیرت ہوئی ــــ میں نے پوچھا ــــ "باپو جی، اگر جواب نہ پہنچنے پر وہ بے وقوف کوئی اور کرتوت کر بیٹھے تو پھر کیا ہوگا؟

جواب میں کہنے لگے ــــ "اس کی تو فکر نہ کر، اس طرح کے غیر مستقل خیالات کے لوگ خواہ کچھ بھی کریں۔ لیکن مرنے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ خودکشی کی ہمت انہیں لوگوں میں ہوتی ہے جو اپنے عہد اور وعدے کیلئے اپنے سر کی بازی لگانا جانتے ہیں۔ جس شخص کے دل کی حالت گھڑی میں تولہ، گھڑی میں ماشہ رہنے والی ہو، اس کی طرف سے یہ اندیشہ کرنا فضول ہے۔ ساتھ ہی باپو جی نے مجھے کڑا حکم دیا ہے کہ میں بھی کبھی یوسف کو خط نہ لکھوں۔ ایسا کرنے کا ان کا مقصد شاید اسے نصیحت دینا ہے۔ کچھ بھی ہو سیما! یہ تو ہمیں تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ باپو جی کے تجربات ہم سے کہیں زیادہ ہیں۔ انہوں نے جو کچھ حکم دیا ہے سوچ سمجھ کر ہی دیا ہوگا ــــ اور میرے خیال میں ہم دونوں کو اس پر عمل کرنا پڑے گا ــــ"

نسیم کا جسم نصف سے زیادہ زمین میں گڑ گیا۔

بڑے شاہ نے سلسلہ بیان جاری رکھا ــــ "میں تیرا دل توڑنا نہیں چاہتا ــــ اگر تو جواب دینا چاہتی ہے تو میں تجھے اس کا پتہ لکھے دیتا ہوں، بے شک تو ڈال دینا۔ میں باپو جی سے ذکر نہ کروں گا"

"نہیں بھائی جان ــــ!" نسیم بولی ــــ "باپو جی نے ضرور ہی سوچ سمجھ کر یہ کہا ہوگا۔ ہم کتنے ہی سمجھدار کیوں نہ ہوں لیکن ان کے سامنے تو بچے ہی ہیں۔ میں تو کئی مرتبہ آزما چکی ہوں، باپو جی کی بات پتھر کی لکیر ہوتی ہے۔ انہوں نے جو کچھ کہا ہے میری بھلائی کے لئے ہی

کہا ہوگا۔ میں خط نہ ڈالوں گی۔ آپ ان سے کہہ دیجیے گا۔"

بوٹے شاہ دنگ رہ گیا۔ کس قدر اعتماد و اعتقاد ہے اس لڑکی کو پرائے باپ پر۔ لیکن بوٹے شاہ کو باپ کی دخل اندازی قطعی پسند نہ آئی۔

کام کی جلدی کی وجہ سے بوٹے شاہ وہاں اور نہ ٹھہر سکا۔ اُس کے جانے کے بعد نسیم نے دونوں خط بستر کے نیچے سے نکال کر پھر صندوق میں رکھ دیئے۔ ایک مرتبہ خیال آیا کہ انہیں پھاڑ کر پھینک دے۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔

Makhdum Library
★ Kamalpura, S.N 15 ★
Malegaon (Dist. Nasik)

Makhdum Library
★ Kamalpura, S.N. 15 ★
Malegaon (Dist. Nasik)

سنہ ۱۹۴۶ کا آخیر اور ۴۷ء کا آغاز تھا ـــــ

پنجاب میں لوہڑی کا تیوہار مشترکہ صورت میں بڑی شان و شوکت اور دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ خاص طور پر دیہات میں رہنے والے کئی ماہ پہلے سے اس تیوہار کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ شاید اسی لیئے ہندو سکھ اسے "سونے کی رات" اور "مسلمان" "شب جشن" کے نام سے پکارتے ہیں۔

اسی سنہری رات کا ذکر ہے ـــ گاؤں کے لوگ شام ہوتے ہوتے اننددوں کی حویلی میں جمع ہونے لگے۔ ایک پرانی چاردیواری میں گھرا ہوا یہ ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ اسی مقام پر لوہڑی، ہولی، دسہرہ اور عید وغیرہ تیوہار منائے جاتے تھے۔

سب سے پہلے گاؤں کے بچے بچیاں آئے، پھر نوجوان لڑکے لڑکیاں اور بعد میں بڑے بوڑھے جمع ہوئے۔ تیسری پارٹی کے آپہنچنے پر عورتوں نے

وہاں سے ہٹ کر کچھ فاصلہ پر ایک علیحدہ لوہڑی جمائی۔ انہوں نے ناچنا، گانا اور نہ جانے کیا ہنسی مذاق کرنی تھی۔ پھر بوڑھے بزرگوں کے سامنے یہ سب کیسے ممکن تھا۔

مردوں کی لوہڑی پر بھی خوب رونق تھی لیکن وہاں کچھ کمی محسوس کی جا رہی تھی۔ سبھی لوگ باباجی کا انتظار کر رہے تھے۔ جن کی غیر موجودگی یہاں رنگ نہ جمنے دے رہی تھی۔

یکایک باباجی اپنی لاٹھی کھٹکھٹاتے ہوئے وہاں آ پہنچے جنہیں دیکھتے ہی اُن پر سوالات کی بوچھار سی ہونے لگی اور دیر سے پہنچنے کی کیفیت طلب کی جانے لگی۔ جس کے جواب میں باباجی نے بتایا کہ صغرا کے مرض میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا اس لئے اُنہیں رُکنا پڑا۔

نسیم کی ماں صغرا کا مرض کوئی نیا نہ تھا، بے چاری ایک لمبے عرصے سے دمہ کی مریض تھی۔ جب بھی دورہ پڑ جاتا تو کئی کئی ہفتے کھاٹ پہ پڑی رہتی رہتی۔ باباجی کی زبانی سب کو معلوم ہوا کہ اُسے صبح سے ہی دورے پڑ رہے ہیں۔

آہستہ آہستہ لوہڑوں کی محفل گرم ہونے لگی۔ سب سے پہلے نوجوانوں کے گیت شروع ہوئے، پھر کھنگڑے کی باری آئی۔ بعد میں بات چیت کی۔ کسی نے خود پر گذری، کسی نے دوسروں پر گذری، کسی نے کسی کے دلیری کے واقعہ کو چٹخارے لے لے کر اس طرح ایک داستان کے بعد دوسری اور پھر تیسری چلتی گئی۔ اور پھر چوری، ڈاکہ اور وارداتوں پر تنقید ہونے لگی

لوہڑی کی تپش میں جیسے جیسے اضافہ ہوتا گیا۔ ان باتوں میں رس بھی اسی طرح بڑھتا گیا ....

موتو کو چھیڑ۔ جو افیون کا عادی ہونے کی وجہ سے چالیس سالہ عمر میں ہی بوڑھا نظر آنے لگا تھا، گُڑ کی موٹی ریوڑی دانتوں سے خالی مسوڑھوں سے پپولتا ہوا سنا رہا تھا۔۔۔ چھیلھاں والے مہتاب سنگھ کھبین کو تو جانتے ہی ہیں آپ، تازہ بیائی کھبیں اُس کی چور کھول لے گئے۔ چند دن ہی ہوئے تھے اُسے خریدے ہوئے۔ تین سو میں خریدی تھی اُس نے۔ کھبیں بھی کیسی تھی، بُت تھی بس۔۔۔ دیکھ دیکھ کر جی نہ بھرتا تھا۔ بات کیا ہوئی جی۔ کھبین کو راتوں رات سہاں سے پار لے گئے چور۔۔۔ کھوجیوں نے بھی کیا کہنے۔ بوڑھا سا موچی تھا ڈھکواں کا کوئی۔ چوروں نے بھی اپنی طرف سے بڑی چالاکی کی، کوس، دو کوس وہ کھبیں کو سہاں میں ہی لے کر چلتے رہے مگر موچی باپ کے بیٹے نے بھی ایسی کھوج لگائی کہ قلعے پہ جا کر کھڑا کر دیا۔

کھگنا برہمن بولا۔۔۔ "بھئی حق حلال کی کمائی ہوگی۔ ورنہ چور سے کیا کہنا اور مال کا واپس ہونا کیا کہنے۔۔۔"

کھوجیوں کی بھی تعریف نہیں چاچا۔۔۔" شہابہ نوجوان بولا۔۔۔ "یہ تو کچھ بھی نہیں، بہت دنوں کی بات ہے لائل پور کے بنجر میں سنا تے ہیں پاؤں میں سینگ باندھ کر چوروں نے چوری کی۔ لیکن کھوج لگانے والوں نے پھر بھی جا کر دبوچ لیا۔"

"ایک سے ایک بڑھ کر پڑے ہیں۔۔۔" بوڑھا دینا ترکمان جو گھٹنوں اور کمر میں پگڑی لپیٹے اور گھٹنوں کو سینے سے سٹائے بیٹھا تھا حقے کا سُوٹا لگا کر اُس کی نلی دوسرے کی طرف ڑھلاتے ہوئے بولا۔۔۔ "کسی چور سے تمہارا سامنا نہیں ہوا۔ یہ جتنے بھی آج کل چوری کرتے ہیں، یہ تو جوتی چور ہیں، جوتی چور، اور آخری الفاظ کی ادائیگی پر زور دینے کی وجہ سے اُسے

کھانسی آ گئی۔ بلغم تھو کنے کے بعد وہ پھر بولا ــــ "چوری جس کی پکڑی گئی ــــ پھر وہ مال ...... چور ہی کیا ہوا۔ اپنے زمانے میں ہم نے وہ وہ چور دیکھے ہیں کہ آنکھوں کا سُرمہ تک نکال لائیں اور سنیدھ نہ نکلے۔"

"ارے بس کر رے بابا گپی ــــ!" درمیان میں ایک منہ پھٹ بول پڑا ــــ "چور نہیں وہ کوئی مداری ہو گا مداری۔"

بابے دینے کو غصہ آ گیا۔ وہ اپنی بلی جیسی آنکھیں اُس نوجوان کی طرف جھپکاتے ہوئے بولا ــــ "بیٹھا رہ آرام سے۔ بڑا سمجھدار بن رہا ہے تجھے کیا سمجھ ان باتوں کی ــــ کل پیدا ہوئی گیدڑی۔ آج نکاح ــــ" اور پھر قریب بیٹھے بزرگ ارجو سہیر دال کی طرف دیکھ کر بولا ــــ "تو یقین نہ کرے گا ارجنا! میں تجھے آنکھوں دیکھی بات سناتا ہوں ایک دفعہ جو ہم گئے بیساکھی پر جیہے سیدن شاہ کے میلے میں، اتفاق سے میرا ایک دوست مل گیا وہاں پر جو اصلی چور کہا جاتا ہے۔ وہ تھا وہ ...۔" مشکل سے ڈکار لیتے ہوئے اُس نے کہا ــــ "ایسی ایسی چوریاں اُس نے کی ہیں اپنے زمانے میں کہ کسی نے کیا کی ہوں گی ــــ رات میں ہم گلاب کے باغ کے قریب جا کر سوئے، وہ بھی میرے قریب کھیس بچھا کر سویا ہوا تھا۔ آدھی رات تک ہم گذری باتیں کرتے رہے۔ اُس نے اپنی دلیری سے کی ہوئی چوریوں کے قصے سُنائے۔ ہمارے قریب ہی دو کھتری ایک کھیس پر سوئے ہوئے تھے۔ کھیس کیا تھا غلیچہ تھا۔ سُرخ رنگ کے ڈیڑھ ڈیڑھ ہاتھ کے کھانے تھے۔ درمیان میں نیلی اور پیلی دھاریاں تھیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ کسی راجہ کو تحفہ دینے کے لئے بُنا ہو گا اُسے جتنی دفعہ کھیس کی طرف میں نظر اُٹھاتا تھا، میرا دل للچا اُٹھتا تھا۔

میں نے اُس سے کہا ۔۔۔ بھائی عمر دین! میں تجھے جب چور مانوں گا جو ان کھتریوں کے نیچے سے کھیس نکال کر مجھے لا دے ۔۔۔ پاک مقام پر بیٹھے ہوئے ہیں، جھوٹ گناہ ہے۔ اُس نے نہ دیر کی، نہ غور کیا۔ اُٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا ۔۔۔ یہ بھی کوئی چوری میں چوری ہے۔ اس طرح کے کام تو چوروں کے بچے کر لیتے ہیں اور فوراً اُٹھ کر اُن دونوں کھتریوں کے درمیان جا کر لمبا ہو گیا۔ کیا مجال جو اُن دونوں کو کھیوں جیسی بھنک بھی پڑی ہو۔ کچھ دیر تو وہ دانت بھینچ کر چپ دونوں کے درمیان پڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ کبھی ایک کو کبھی دوسرے کو کندھا مار کر دونوں سرکتا گیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ کھیس کو اپنی طرف کھسکاتا گیا۔ تبھی معلوم ہوا کہ وہ آدمی کا بچہ کھیس بغل میں دبائے میرے سرہانے آ کھڑا ہوا۔ دونوں کھتری زمین پر پڑے خراٹے بھر رہے تھے۔ اسے کہتے ہیں آنکھوں میں سے سرمہ چرا کر لے آنے والی چوری۔"

"بھئی واہ ۔۔۔ بات ہوئی نہ ۔۔۔" اسی طرح سبھی نے تعریف کی اور چور اور اُس کی چوری کی داد دینے لگے۔

تارا سنگھ چڈھا جو لوہڑی کی تپش سے بچنے کے لئے پیچھے کی طرف سرکتا آ رہا تھا لوئی اُتار کر سمیٹتا ہوا بولا۔

"آج کل جو نئے نئے چور پیدا ہو گئے ہیں، اُنہیں ہم کیا کہیں۔ کسی بے چارے راہگیر کو پیچھے سے آ کر چھرا گھونپ دینا۔"

"لچر پن ہے اور کیا ہے ۔۔۔" دینا پھر بولا ۔۔۔ "یہ تو آجکل نئی بہادری رہ گئی ہے ۔۔۔"

دینے کی بات سُن کر بھگتا برہمن کہنے لگا ۔۔۔ "بات یہ ہے

دکھائی دیتے! یہ چھرے چلانے والے جو تو کہہ رہا ہے نا! سچ پوچھو تو
اس میں قصور ان بیچاروں کا بھی نہیں، یہ ساری مہربانی ہمارے لیڈروں
کی ہے جو ایسے بیج دے کر ہم سب کو آپس میں بھڑوا رہے ہیں اور خود
دور بیٹھے تماشہ دیکھتے رہتے ہیں۔ سامنے دیکھ لیجئے۔ کبھی بنگال
میں جو خون خرابہ ہوا تھا وہ کس نے کرایا تھا؟ پھر باری آئی بہار کی ۔۔۔
ایک مقام پر ہندو قتل کئے گئے اور دوسری جگہ مسلمان۔ بھلا بتائیے ان
لیڈروں کی ماں کا اس میں کیا گیا؟ مارے گئے ماؤں کے بیٹے ۔۔۔
کبھی کوئی لیڈر مرتا دیکھا ہے؟ لوگوں کو بھڑکا کر بھڑوا دیا۔ خود ایک
طرف ہو جاتے ہیں۔ گاؤں میں آگ لگی، کتنا نالی ہیں۔"

"آپ کی بات لاکھ روپے کی ہے اوجھا جی! ۔۔۔" سنتے چندو ک
نے سنجیدگی سے تبسم ہوتے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا
"بیٹا نہیں بھئی ان لوگوں کو کب عقل آئے گی۔ بیٹا نہیں اس طرح لڑا لڑا کر
ملک تباہ کریں گے یہ گھڑم چودھری ۔۔۔"

بابا بھا نے ابھی تک خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ جواب میں بولا۔
"ذرا آپ ہی سنئے! لیڈر بھی سبھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ جن لیڈروں
کے دلوں میں ہندو مسلمانوں کا یکساں درد ہے، اُن کی بات سنتا
سمجھتا ہے۔ گاندھی جی نے مرنے کا برت کیوں رکھا تھا پچھلے مہینے؟
جواہر لال نے بہار کے ہندوؤں کو للکار کر کہہ دیا تھا کہ اگر آپ بہار
کے مسلمان بھائیوں پر ظلم کرنے سے باز نہ آئیں گے تو میں بم مار مار کر
آپ کو تباہ کر دوں گا ۔۔۔ اور آخر میں دونوں لیڈر وہاں سے واپس
لوٹے امن کروا کر۔ لیکن تالی ہمیشہ دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ اگر

دوسری طرف کے لیڈر بھی اس طرح کی کوشش کرتے تو آج دنگے فساد کا کہیں بھی نام و نشان نہ رہتا ــــ"

"مذہبی معاملوں میں دخل نہ دیجئے بابا جی ــــ"! لوہڑی کے اکھاڑے میں سے ایک تیز کھڑکیلی آواز سُنائی دی ــــ مسلمان لیڈروں پر الزام لگانے کا آپ کو کوئی حق نہیں ــــ"

سب کی توجہ اس بولنے والے کی طرف ہو گئی۔

لوہڑی کی آگ میں سندوری لپٹیں اُٹھ رہی تھیں اور جیسے جیسے تمتماہٹ جاتی چاروں طرف گھیرا چوڑا ہوتا جا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ سبھی پیچھے سرکنے لگے۔

بابے کی بات کے جواب میں بولنے والا منشی عبدالرحمن تھا، جو یہاں کے سرکاری سکول کا مدرس تھا۔

عبدالرحمن کولیاں حمید کا رہنے والا تھا جو اس گاؤں سے تقریباً میل سوا میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ دوپہر کا کھانا ساتھ لے کر وہ روزانہ سویرے سویرے اپنے گاؤں سے آتا اور شام کو چھٹی ہونے کے بعد واپس چلا جاتا تھا لیکن اِدھر کئی دنوں سے وہ رات میں بھی یہیں ٹھہر جاتا۔ جس کی ایک خاص وجہ تھی۔

چونکہ بابا کھانا اور بوٹے شاہ اس گاؤں میں تعلیم یافتہ سمجھے جاتے تھے اور اُنھوں نے ایک آدھ اخبار بھی جاری کروا رکھا تھا۔ جب بھی ڈاک آنے کا وقت ہوتا۔ گاؤں کے کئی لوگ جو خبریں سُننے کے شوقین ہوتے بابے کی حویلی میں جمع ہو جاتے تھے۔ لیکن اِدھر چند دنوں سے ان شوقینوں کی تعداد کم ہونے لگی تھی۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ

منشی عبدالرحمٰن نے بھی ایک مسلم اخبار جاری کرا لیا تھا۔
پہلے تو منشی نے معمولی طور سے گاؤں کے مسلمانوں کو اخبار سنانے کے لیئے بلایا۔ نتیجتاً کئی لوگوں نے اس مطلب کے لیئے اُس کے پاس جانا شروع کر دیا۔ لیکن گذشتہ دو ہفتے ہوئے اُس نے صاف صاف کہہ دیا کہ ہندوؤں کے اخبار سننے والے مسلمان، مسلمان نہیں کافر ہیں۔"
فسادوں کی آندھی جو بنگال سے چل کر پنجاب کی طرف تیزی سے بڑھی چلی آ رہی تھی اُس کا اثر اس علاقہ پر ہوتا نظر آ رہا تھا۔ خاص طور سے جب سے ہزارہ کے علاقہ میں فساد شروع ہوئے تھے، بابا بھانا اور ککفر لوں کی آبادی بھی اس سے ناواقف نہ تھی۔ لیکن اُن کے لیئے فکر کی کوئی وجہ نہ تھی۔ کیونکہ سبھی جانتے تھے کہ اس علاقے کی محبت اور اتحاد فساد کی ہوا کے جھونکے اِدھر نہ آنے دیگا۔ مگر جب سے منشی عبدالرحمٰن کی سرگرمیاں شروع ہوئیں تو کچھ نہ کچھ مستقبل کا اندازہ ہونے لگا تھا۔
جیسے ہی بابے کے جواب میں منشی نے ایک گستاخ اور جوشیلی آواز میں یہ بات کہی سارے اکھاڑے کی آنکھیں اُس پر جا لگیں۔
"برخوردار ــــ!" بابے نے اپنے قدرتی استقلال کے ساتھ جواب دیا۔ مذہبی معاملوں کو میں آپ سے زیادہ سمجھتا ہوں اور ہر مذہب کی اُتنی ہی عزت کرتا ہوں جتنی اپنے مذہب کی ــــ میں تو لیڈروں کی عادت کی بات کر رہا تھا۔ اگر سبھی لیڈر پنڈت نہرو اور گاندھی جی جیسے ہو جاتے تو........"
"ایک مرتبہ پھر وہی آواز آئی جس نے بابے کے بیان کو درمیان ہی میں روک دیا ــــ" اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کے لیڈر پہلے

ہیں اور ہمارے بڑے۔ میں سچ کہہ رہا ہوں کہ یہ گاندھی اور نہرو جو آپ لیئے پھر رہے ہیں ہمارے قائدِ اعظم کی جوتی کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے آپ جاہلوں کو کیا معلوم ان سیاسی باتوں کا گاؤں کی چار دیواری میں آپ لوگ کیا جانیں کہ آپ کے گاندھی اور نہرو در اصل کون ہیں؟ انگریز کے سب سے بڑے ایجنٹ ہیں جو......"

"منشی ــــــ!" کسی پیش آنے والے حادثہ سے گھبرا کر چودھری فضل کریم نے کہا ــــــ "چھوڑو اس فضول بحث کو، ایسا خوبصورت سماں بندھا ہوا ہے اور آپ لے کر بیٹھے ہیں یہ فضول باتیں ــــــ"

"فضول باتیں ــــــ!" منشی خاموش ہونے کی بجائے اور زیادہ گرم جوشی سے بولا ــــــ "یہی تو چودھری جی! آپ گنوار لوگوں کی ناسمجھی ہے۔ آپ کیلئے یہ فضول باتیں ہیں۔ لیکن باہر جا کر دیکھئے نا! دنیا میں کیا کیا ہنگامے ہو رہے ہیں۔ جنابِ عالی! باتیں کرنی آسان ہیں۔ حضرت قائدِ اعظم کی قربانیوں سے کون انجان ہے؟ لاکھوں کا مالک ہو کر بھی بھوکا پیاسا دن رات پیدل سفر کر رہا ہے ــــــ اسلام کی خدمت کے لئے ہی وہ سفر برداشت کر رہا ہے ــــــ در اصل انگریز کی غلامی نے ہم سب کی عقل پر پردہ ڈال دیا ہے۔"

بوڑھا دینا دوسری طرف سے بول اٹھا۔ "مگر منشی جی! اب تو انگریزوں کی حکومت جانے والی ہے، سنا ہے جلدی ہی ہم لوگوں کی حکومت ہونے والی ہے ــــــ"

"اس مغالطہ میں نہ رہیئے ــــــ" منشی بولا ــــــ

ہو تو کتوں سے نکل کر کھڈے میں گرنے والی بات ہے۔ انگریز کی حکومت میں سوئے ہوئے تھے۔ کوئی کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھ سکتا تھا لیکن جس دن ان کانگریسی ہندوؤں کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ ڈور آ گئی تو یاد رکھنا میری بات یہ مسلمانوں کو توبے بھر روٹی نہ رکھنے دیں گے۔ مسلمانوں کی ہستی محفوظ ہو گی، جب اس ملک پر پاکستانی پرچم لہرائے گا۔ کیسے ہے اس بات کا پتہ کہ آج ہمارا مذہب کتنے خطرے میں ہے۔ جنگ گرد گرداتے رہنا آسان ہے لیکن قوم کی خدمت کرنا مشکل ہے۔ آج کیا حالت ہے۔ بھوک اور ننگا پن ہی ورثے میں آیا ہے۔"

منشی کی باتوں نے لوہڑی کا مزا کرکرا کر دیا۔ اب سے تھوڑی دیر پہلے لوگوں کے دلوں سے لے کر چہروں تک جو خوشی برس رہی تھی، اُس کی جگہ ناپسندیدگی اور اندیشے نے لے لی کچھ بے اعتباری کے جذبات نے سبھی کے دل بوجھل کر دئیے۔ کئی یوں تو منشی کے سلوک کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہوئے بابے کی بے عزتی محسوس کی جس کا کچھ حصہ چودھری فضل کریم کے ان لفظوں سے دور ہو گیا ـــ

"بات آپ کی درست ہے منشی جی! بھئی غلام آدمی کا ایمان کچھ بھی نہیں ہوتا ـــ لیکن بابا جی کی بات بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی ـــ بھلا آپ بتائیے کہ گاندھی جی نے بھوک ہڑتال کیوں کی تھی؟ اور ساتھ ہی یہ بات بتائیے کہ یہ بات غلط ہے جو اخباروں میں شائع ہوئی تھی کہ جواہر لال نے بہار کے ہندوؤں کو بم سے اُڑانے کی دھمکی دی تھی۔ بابا جی کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ بھئی اگر قائدِ اعظم یا مسلم لیڈر بھی اُن کی طرح اپنے علاقوں میں فسادوں کو روکنے کی کوشش

کرتے تو پھر کیوں یہ قیامت آتی ہمارے ملک پر ——"

"آپ نہیں جانتے ان باتوں کو چودھری جی! ——" ملنسٹی نے اُسی تلخی سے کہا —— "یہ سبھی نکلے کے آنسو ہیں جو بہا بہا کر لوگوں کو یقین دلانا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کی چالیں اس قدر گہری ہیں کہ آپ جیسے مرنجے دماغ اُنہیں سمجھ نہیں سکتے۔ فرض کیا نہرو نے اپنے بھائیوں کو موت کی دھمکی دی۔ مگر میں پوچھتا ہوں کہ چار پانچ مہینے ہو چکے ہیں، وہ سرحدی قبائلیوں کے پاس کیا لینے گیا تھا؟ سُنئے آپ کو اصلی راز کی بات بتاتا ہوں۔ قبائلیوں کے پاس بھی وہ یہ بہانہ بنا کر گیا تھا کہ میں اُن لوگوں کو تہذیب کا سبق سکھاؤں گا۔ چوریوں اور ڈاکوں سے اُنہیں روکوں گا —— اُن کی مالی مشکلات رفع کرونگا لیکن اُس کا مطلب کیا تھا آپ کو معلوم نہیں؟ انگریز کی طرح ان لوگوں کو رشوت دے کر مسلم لیگ کے خلاف لڑائی کے لئے تیار کرنا۔ وہ اپنے آپ میں بڑا چالاک بنا پھرتا ہے، لیکن ہمارے لیڈروں کی نظروں میں وہ ابھی پیدا ہی نہیں ہوا۔ قائدِ اعظم نے ایسا چکر چلایا کہ نہرو جی مُنہ کی کھا کر لوٹ آئے یہی شکر کیجئے کہ جان بچ گئی۔ ورنہ جس طرح اُن کے ہوائی جہاز پر گولیاں برسنے لگی تھیں، اگر قائدِ اعظم وہاں جا کر نہ روکتے تو نہرو جی کی کہیں ہڈی پسلی بھی نہ ملتی۔ وہ اُن خیر خواہوں کو ساتھ لے کر جا رہا تھا، عبدالغفار اور ڈاکٹر خان کو، اُن کی بھی مالاکنڈ میں چٹنی بن جاتی اگر قائدِ اعظم بیچ میں پڑ کر صلح نہ کرا دیتے ——"

"لیکن قائدِ اعظم اُس وقت تھے کہاں ...؟" بوڑھے شاہ نے

بمشکل منشی سے اتنا ہی کہا تھا کہ قریب بیٹھے ہوئے بابے نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا ــــ اور خود بولے۔

"منشی جی! معاف کرنا، میرا مطلب آپ نے غلط سمجھا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہندو لیڈر سبھی نیک اور مسلمان سبھی بُرے ہیں۔ میں نے تو یہ کہا ہے کہ نہرو اور گاندھی اگر بہار میں جا کر فساد روک سکتے تھے تو جناح صاحب بھی اگر چاہتے تو مسلمان علاقوں میں اس دنگا کو پھیلنے سے روک سکتے تھے ـــ اب آپ یہی دیکھ لیجئے کہ ہزارہ میں جو گڑبڑ ہوئی ہے اگر مسلمانوں کا کوئی بارسوخ لیڈر اُسے روکنے کی کوشش کرتا تو وہ رُک نہیں سکتی تھی ـــ؟"

"رُکنے رُکانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے اب یہ معاملہ ایک دو ہو کر ہی رہے گا ـــ" منشی بولا۔

"ایک دو کس طرح ـــ؟" بابے نے پوچھا۔

"اس طرح ـــ" منشی بولا ـــ "مسلمان علاقوں سے سبھی ہندو سکھ نکل جائیں۔ اور ہندو علاقوں میں کوئی بھی مسلمان نہ رہے۔ حضرت قائدِ اعظم نے خود فرمایا تھا کہ قدرتی طور سے جب یہ دونوں قومیں علیحدہ علیحدہ ہیں تو ان کی آبادیاں بھی جب تک تقسیم نہ کی گئیں جھگڑا ختم ہوا ہے نہ ہوگا۔"

"مگر منشی جی!" بابے نے جواب دیا ـــ "آبادی کا تبادلہ تو الٹا مسلمانوں کو مہنگا پڑے گا۔ بیس کروڑ ہندو اور سکھ ایک طرف اور نو کروڑ مسلمان دوسری طرف ہو گئے تو اس طرح ایک بڑی قوم کے سامنے ایک چھوٹی قوم کا آرام سے رہنا

مشکل ہوجائے گا ۔۔۔"

"مشکل ہو جائے گا!" منشی نے جوش کے ساتھ بولا۔ "لیکن باباجی۔ آپ یہ بات بھول گئے ہیں کہ مسلمان کبھی کسی کے دباؤ میں آنے والے نہیں۔ ایک مرتبہ ہماری قوم پاکستانی پرچم کے نیچے یکجا ہو جائے پھر دیکھنا آپ کے یہ تیس کروڑ کدھر جاتے ہیں۔ اگر ان سب کو اورنگ زیبی زمانہ یاد نہ دلا دیا تو کہنا۔"

بابے اس کے بعد خاموش ہو گیا' وہ دیکھ رہا تھا کہ یہ منشی شاید پاکستان بننے سے پیشتر ہی غازی کا خطاب حاصل کرنے کے لئے آمادہ ہے۔"

کچھ دیر تک کوٹھڑی کا سارا ماحول ایک اُداس خاموشی میں غرق رہا گویا کسی کے پاس کہنے کے لئے کچھ بھی نہ ہو ہر شخص یہی سوچ رہا تھا ۔۔۔

"کہاں سے آگیا یہ کمبخت جس نے جشن کے مزے کو کرکرا کر دیا ۔۔۔"

"اچھا اب بس کیجئے منشی جی ۔۔۔" فضل کریم نے بے چین ہو کر منشی سے کہا اور پھر سب کی طرف دیکھ کر بولا ۔۔۔ "چلو بھائی چلیں سب اپنے اپنے گھروں کو ۔۔۔"

اور آہستہ آہستہ سبھی تتر بتر ہو گئے۔

Makhdum Library
★ Kamalpura, S N 15 ★
Malegaon (Dist Nasik)

لوہڑی کا تیوہار ختم ہوا اور ایک نئے تیوہار کا انتظار ہونے لگا۔ ہولی کا۔

کب سے یہ تیوہار شروع ہوا اور کیسے ہوا؟ اس کی بابت ان گنت کہانیاں ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ اہمیت جسے دی جاتی ہے وہ ہے پرہلاد اور اُس کی پھوپھی ہولکا کا واقعہ۔ مشہور ہے کہ ہرن کشیپ جب اپنے بیٹے پرہلاد کو مارنے میں کامیاب نہ ہوا تو اُس کی بہن ہولکا نے یہ ذمہ داری خود پر لے لی۔ کہا جاتا ہے کہ دیوتاؤں نے ہولکا کو یہ دعا دی تھی کہ اُس کے جسم پر آگ کا قطعی اثر نہ ہوگا اس لئے وہ پرہلاد کو لے کر جلتی ہوئی آگ میں مسلسل سات روز تک بیٹھی رہی اُس کا خیال تھا کہ اس طرح پرہلاد کا خاتمہ ہو جائے گا لیکن نتیجہ اس کے خلاف نکلا، ہولکا جل گئی اور پرہلاد بچ گیا۔ یعنی سچائی کی فتح اور جھوٹ کی شکست —

کبھی کبھی تاریخ خود کو دوہرایا کرتی ہے۔ شاید ۱۹۴۷ء میں بھی ویسا ہی دیکھنے میں آیا اگر فرق دیکھنے کو ملا تو صرف یہ کہ جھوٹ فتحیاب ہوا اور سچائی کو شکست نصیب ہوئی۔ ٹھیک اسی طرح جیسے ہولکا پرہلاد کو گود میں لے کر دھدھکتی آگ میں بیٹھی رہی نتیجتاً پرہلاد جل کر خاک ہوا اور ہولکا محفوظ رہی۔

کسے معلوم تھا کہ اس مرتبہ کا پھاگن لوگوں کیلئے خوشیوں کے بجائے مصیبت کا پیغام لے کر آئے گا۔ پنجابیوں کو رنگوں سے بجائے خون کی ہولی کھیلنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ کون جانتا تھا کہ پنجاب کے رحمدل لوگ، جن کی بہادری دلیری اور ملن ساری کی دھاک مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی ہے اس مہینے کے ختم ہوتے ہوتے انسان کو چھوڑ کر حیوان اور حیوان کو چھوڑ کر دیو کی شکل اختیار کر لے گی۔

سکون کے ساتھ پھاگن کا دوسرا پاکھ گذر رہا تھا۔ جب شہروں سے اٹھ کر فسادوں کے واقعات کا اثر گاؤں کے معصوم دل اور دوستی پسند دیہاتیوں پر بھی پڑنا شروع ہوا۔

بڑے بڑے شہروں میں انسانی خون کی پیاسی اس دبا کا اثر سب سے پہلے پڑا۔ اور پھر آہستہ آہستہ چھوٹے چھوٹے گاؤں بھی اس کی لپیٹ میں آنے شروع ہو گئے۔

یوں تو کلہری گاؤں چھوٹا سا تھا لیکن اس کا شمار بڑے گاؤں میں بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ اس لیئے اس پر یہ اثر کچھ دیر سے ہوا۔ صدیوں سے اس گاؤں میں اپنے پن کی روایت قائم تھی۔ بھگوان کی یہ بیش قیمت دین نہ صرف اسی گاؤں کے حصہ میں آئی تھی، بلکہ پوٹھوہاری

گاؤں کا رہن سہن ہی کچھ اس قسم کا تھا کہ وہاں ایک کے بغیر ایک کا گذر ہونا مشکل تھا۔ ہر شخص کی زندگی ایک دوسرے سے وابستہ تھی۔ مذہبی عقیدے مختلف ہونے کے باوجود ان لوگوں میں بیگانگی کا جذبہ کہیں نظر نہ آتا تھا۔ اگر کبھی کوئی مذہبی ان بن ہو بھی جاتی تو دو چار روز کے لئے چند لوگوں کے دلوں میں بیگانہ پن کا جذبہ ضرور بیدار ہو جاتا۔ تو ان شرارتوں کے پیٹھ موڑتے کی دیر ہوتی کہ ان لوگوں کے وہ جذبات پھر بھائی چارے میں تبدیل ہو جاتے۔

فسادات کی خبریں کافی مدت تک خبروں کی ہی شکلوں میں آتی رہیں۔ کسی کے دل میں مذہبی تنگ خیالی کا جذبہ پیدا نہ ہوا۔ لیکن جب سے منشی عبدالرحمٰن اور اُس کے ساتھیوں نے اِن خبروں میں نمک مرچ لگانا شروع کیا تبھی سے یہاں کے ہندو سکھوں میں گھبراہٹ کے اثرات نظر آنے لگے۔ گاؤں کے چند مسلم نوجوان منشی کے شاگرد ہو گئے لیکن اپنے سرپرستوں سے چھپ کر۔ جب کبھی کسی بڑے بوڑھے کے کان میں یہ بھنک پڑ جاتی کہ اس کا بیٹا یا بھتیجا کسی شرارتی کام میں حصہ لے رہا ہے۔ تو اس گھر میں ایک طرح جھگڑا پیدا ہو جاتا۔

راولپنڈی کی طرف سے فساد شروع ہو کر آہستہ آہستہ ہر سمت پھیلنے لگا۔ جیوں ہی کلہری کے لوگوں کو فسادوں کی تپش قریب آتی محسوس ہوئی۔ سارا گاؤں چوکنا ہو گیا۔ گاؤں کے عمر رسیدہ اور معزز مسلمانوں نے پنچایت میں جمع ہو کر اور قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ اپنے گاؤں کے کسی ہندو سکھوں کی طرف کسی فسادی کی

نگاہ بھی نہ اُٹھنے دیں گے۔ اُنھوں نے آپس میں پکا گٹھ بندھن کر لیا کہ اپنے خون کی آخری بوند تک بہا کر گاؤں کے غیر مسلموں کی حفاظت کریں گے۔ لیکن دوسری طرف یہ لوگ اس خطرے سے بھی بے خبر نہ تھے جو ان کو اپنے ان نوجوانوں کی طرف سے ہر وقت تیار رہتا ہے جو منشی کے آگے پیچھے گھومتے دکھائی دیتے تھے۔ اس کے بعد یہ خطرہ اور بھی بڑھ گیا جب اکیلے منشی کے بجائے اُس کے ساتھ ایک دوسرے مولوی نے بھی چکر لگانے شروع کر دیئے۔

کھتریوں کے لئے یہ وقت نہایت خطرناک تھا۔ بچاؤ کی کوئی اُمید تھی تو اپنے مسلمان پڑوسیوں سے ہی جنہوں نے مردانگی کے ساتھ اپنے سینے پر ہاتھ مار کر کہہ دیا تھا کہ "بھائیو! فکر نہ کرو، آپ تک کوئی ہمارا خاتمہ کر کے ہی پہنچ سکے گا۔

پہلے تو گاؤں کے کھتری بے فکری سے بیٹھے رہے جب کہ مسلمان پڑوسیوں نے اُن کی ذمہ داری خود پر لے لی تھی۔ لیکن جلد ہی یہ بھروسہ بھی خاک میں مل گیا۔ ان علاقوں کے جن گاؤں میں اب بھی لوٹ کھسوٹ جاری تھی وہ زیادہ تر دور سے آئے ہوئے بلوائیوں نے کی تھی۔

اس طرح کے واقعات جگہ جگہ کے کھتریوں نے سُنے تو اُن کی فکر میں ہر روز اضافہ ہوتا گیا۔ اب اُنہیں اپنے مسلمان پڑوسیوں کے وعدوں اور بھروسوں پر اعتبار نہ رہ گیا تھا۔ لیکن ان تمام گھروں میں ایک گھر ایسا بھی تھا جس کا اعتبار ابھی تک قائم تھا جتنی مرتبہ گاؤں کے کھتریوں نے بابے بھانے سے گاؤں چھوڑ دینے کے لئے کہا

تو بابے نے ایک ہی جواب میں ہمیں لاجواب کر دیا۔

"دوستو! تقدیر کی تحریر کو کوئی مٹا نہیں سکتا۔ جس کو رکھے رام اُسے مار سکے نہ کوئی!"

•••

Library
S N 15
Malegaon (Dist Nasik)

Makhdum Library
S N 15
Kamalpura,
Malegaon (Dist Nasik)

Makhdum Library
Kamalpura, S N 15
Malegaon (Dist Nasik)

شام کے سات بجے کا وقت تھا۔ اُداس، سرد اور خوفناک سائے نے گاؤں کی شوخی کا گویا گلا گھونٹ دیا تھا۔ ہوائیں خنکی تھی اور بہت تیز روانی۔ لیکن اچھی نہ لگ رہی تھی۔

بوڑھے شاہ آہستہ قدموں سے کھیتوں میں سے ہوکر گاؤں کی طرف لوٹ رہا تھا۔ اگر اس وقت کوئی اس کے چہرے کو دیکھتا تو یہی محسوس کرتا کہ اس کی ٹانگیں اپنی طاقت سے رواں نہیں ہیں بلکہ اُنہیں چلنے کے لئے مجبور کیا جا رہا ہے۔

گاؤں کی گلیاں سنسان تھیں کسی طرف سے بھی کسی کے بولنے کی آواز سُنائی نہ دے رہی تھی۔ اونچے پیپل کی ٹہنیوں میں سے کبھی کبھی چمگادڑوں سے چیخنے کی خوفناک آواز یا آسمان میں اُڑتے گدھوں کے وزنی پروں کی بے ترتیب پھڑپھڑاہٹ رہ رہ کر سُنائی دے جاتی تھی۔

آنندوں کی حویلی کے قریب جاکر بوٹے شاہ کے قدم اور بھی کمزور پڑ گئے۔ پرانی اینٹوں کی خستہ دیوار کے اوپر سے اندرونی حصے پر اُس نے ایک مختصر سی نگاہ ڈالی۔ اور ایک سرد سانس کے ساتھ ہٹالی۔ اُسے یاد آیا کہ گذشتہ سال آج ہی کے دن جب پہلی ہولی اُتری تھی تو شام کے وقت سے سوتے وقت تک یہاں کتنی رونق تھی۔ گاؤں کے کھتری اور مسلمان نوجوانوں نے ہولی کی جھانکیاں نکالنے کیلئے بہت سے زیادہ روپے یہیں بیٹھے بیٹھے ہی جمع کر لیئے تھے۔ پھر اُسے چودھری فضل کریم کے اعلان کیئے گئے ان دس روپیوں کی یاد آگئی جو اُنہوں نے اس نوجوان کو دینے کا اعلان کیا تھا جو اپنا سوانگ ایسا بنائے کہ جھانکیوں کے ختم ہونے تک نہ پہچانا جاسکے۔ یہ مقام حاصل کرنے کیلئے بھلے ہی کئی ایک نے بے انتہا کوششیں کی تھیں لیکن آخر میں نسیم کے بھائی عزیز کو ہی یہ عزت حاصل ہوئی تھی جس نے خود کو سادھو کی شکل میں پیش کیا تھا۔

گذشتہ سال کی چہل پہل کا مقابلہ جب بوٹے شاہ نے آج کے دن سے کیا تو اُس کے دل کو ٹھیس لگی۔ آج یہ پہلی ہولی تھی جس کی آمد کی خوشی گاؤں والوں کو قطعی نہ تھی۔ ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر فسادوں ہی کا ذکر تھا۔ باقی سبھی کچھ گو یا ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا ہو۔

آنندوں کی حویلی سے چل کر گھر تک پہنچنے تک جو تصویر بوٹے شاہ کی آنکھوں کے آگے رقصاں تھی، اُس کی فکر نے اُس کی سانسوں کو بوجھل کر دیا۔ وہ تصویر اُس کی دھرم بہن نسیم کی تھی جس کے چہرے کی طرف وہ ان دنوں جتنی مرتبہ دیکھتا اُس کا دل بیٹھنے لگتا۔

نسیم اب ہنستی نہ تھی اور بوٹے شاہ کو نسیم کی جو چیز سب سے اچھی معلوم ہوتی تھی اُس کی حیات پرور تحدود اور دھیمی دھیمی مسکان جو شاید اُس وقت سے اُس کے ہونٹوں سے گم ہو چکی تھی جب سے یوسف والا واقعہ پیش آیا تھا۔ لیکن جس دن سے فسادات کی نا اُمیدی سے پُر خبریں پھیلنی شروع ہوئیں اُس روز سے نسیم کا چہرہ اُسے ایسا محسوس ہونے لگا گویا اُس کے گورے چہرے سے سُرخی دن بدن کم ہوتی جارہی ہے اور اُس کی جگہ زردی لیتی جارہی ہے نسیم کی پُرکشش آنکھوں میں اُن دنوں بوٹے شاہ کو کبھی نہ ختم ہونے والی نا اُمیدی کی جھلک نظر آتی تھی۔ جتنی مرتبہ بھی وہ نظر اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھتا اُسے محسوس ہوتا گویا نسیم دل کسی ناقابل برداشت بوجھ کے تلے دبتا جا رہا ہے کچھ پتہ نہیں اُس کا دل کب اس بوجھ تلے کھٹ کھٹ کر پاش ہو جائے۔

کئی دنوں سے وہ مسلسل یہی سوچ رہا تھا کہ نسیم سے تنہائی میں مل کر اُس کے دل کا راز معلوم کرنے کی کوشش کرے۔ موقع پا کر اُسے تسلّی دے گا اور اُس کی ذہنی تکلیف دور کرنے کی کوشش کرے گا۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔

آج جب وہ گھر پہنچا تو اُس کے دل میں ایک اور خیال پیدا ہوا کہ اُسے یہ کام اپنی بیوی رُکمن کے سپرد کر دینا چاہیے اس طرح اُس کا مقصد پورا ہو سکتا ہے۔ یہ سوچ کر گھر میں داخل ہوتے ہی وہ سب سے پہلے رُکمن کے پاس پہنچا۔

رُکمن اونچے قد اور خوبصورت ناک نقشے والی عورت تھی ۔ جس کی چوڑی پیشانی کو دیکھ کر اُس کے دل کی محبت اور نرمی بھرے

جذبات کا اندازہ آسانی سے لگ جاتا ہے۔ اُس کی عمر پچھلے ہی پچیس چھبیس سال کی ہے اور اُس کی شادی ہوئے دس سال گزر چکے ہیں۔ لیکن اُس کے جسم کے ہر حصے سے ابھی کنوارہ پن جھلکتا ہے۔ شاید اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ ابھی تک بے اولاد ہے۔ کوئی بچہ نہ ہوتے سے غم نے اُس کی خوبصورتی کو چرالیا اور نا اُمیدی کی ایک بدلی ہر وقت اُس کے چہرے پر چھائی رہتی ہے۔ پھر بھی اُس کی ظاہری خوبصورتی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اپنے سے چھوٹوں اور بڑوں سے وہ یکساں سہیلیوں کی طرح کھل کر ہنستی کھیلتی ہے۔ اور یہ سب کچھ شاید نا اُمیدیوں کی اُس بدلی سے نجات کے لیئے کرتی ہو۔ ہمیشہ۔ جہاں تک ممکن ہو سکے وہ خود کو اُس درد سے دور رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔

بوٹے شاہ نے برائے نام کھانا کھایا۔ جب کُلا کرنے کے بعد وہ تولیے سے ہاتھ پونچھ رہا تھا۔ تب رکمن نے پوچھا۔

"کیا بات ہے آج کھانا بیچ میں چھوڑ دیا؟"

"یوں ہی آج بھوک کچھ کم تھی۔"

"نہیں، آپ جھوٹ بولتے ہیں۔ آج آپ کا چہرہ بھی کچھ کچھ اُداس نظر آتا ہے۔"

جواب میں اُسے بوٹے شاہ نے چند لفظوں میں بتادیا کہ اُسکی اُداسی کی وجہ وہی ہے جو آج کل ہر ایک کی اُداسی کی وجہ ہے۔ اور رکمن نے جواب میں بات بنانے کی دلیلوں کے ساتھ "بھگوان کی مرضی" کہہ کر ہمیشہ با اُمید رہنے کی تلقین کرنے لگی تو بوٹے شاہ نے اس موضوع کو درمیان میں ہی چھوڑ کر دوسرا شروع کر دیا۔

"تیری بات ٹھیک ہے، جو کچھ بھی ہوتا ہے اُس کی مرضی سے ہوتا ہے، ہمیں اُس پر صبر وشکر رکھنا چاہیئے۔ لیکن ایک دوسری بات ہے جس کی فکر دن رات مجھے کھائی جارہی ہے۔"

"کون سی۔۔۔ ؟" رکمن نے جاننے کی بیتابی ظاہر کی۔

"سیما کی حالت تو نے کبھی دیکھی ہے ؟"

"دیکھ کیوں نہیں رہی۔ معلوم نہیں کیا ہوگیا ہے اس لڑکی کو۔۔۔ دنوں میں سوکھ گئی ہے، پہلے جب کبھی آتی تھی تو ہنسی مذاق اور اچھل کود سے ہمیں نہ بیٹھنے دیتی تھی۔ لیکن اب تو گویا اُس کے منہ میں زبان ہی نہیں ہے۔"

"تجھے کبھی پوچھنا تو چاہیئے تھا کہ اُسے کیا تکلیف ہے۔"

"کئی دفعہ پوچھ پوچھ کر تھک گئی ہوں، وہ تو ناک پر مکھی بیٹھنے ہی نہیں دیتی۔ جب کبھی پوچھتی ہوں۔ بس یہی کہہ کر ٹال دیتی ہے۔۔۔ کیا کبھی ! تجھے تو وہم کی بیماری ہوگئی ہے۔۔۔"

"لیکن میرا خیال ہے، ضرور کچھ......."

بات ابھی اُس کی زبان پر ہی تھی کہ باہر سے کسی نے پکارا۔ جس کی وجہ سے بات ادھوری ہی چھوڑ کر وہ باہر نکل گیا۔

Makhdum Library
Kamalpur N 15
Malegaon (Dist Nasik)

Library
M 15
Dist Nasik

باہر آکر چار آدمیوں کو اُس نے صحن میں کھڑے ہوئے دیکھا۔ سکول کا منشی عبد الرحمٰن، ایک وہی دُبلا پتلا کمزور شخص، جو داڑھی سے مولوی نظر آیا تھا۔ تیسرا ہدایت موچی کا بیٹا عنایت اور چوتھا قصاب کا بیٹا علم دین۔

"آئیے ——" بوٹے شاہ نے مسکرا کر کہا۔

جواب میں علم دین نے پوچھا —— "تاؤ جی کہاں ہیں؟"

"اندر لیٹے ہوئے ہیں ——" کہہ کر وہ چاروں کو ساتھ لے کر چلا گیا —— بیٹھک کا دروازہ اندر سے بند تھا اور ایک ضعیف لرزتی ہوئی اور بیراگ بھری آواز آرہی تھی۔

"رام نام کہتے رہو، دھرے رہو من دھیر
کام آپ سنوار دیں گے، رام چندر رگھو ویر"

"صاحب سلامت تاؤ جی!" عنایت نے سب سے آگے بڑھ کر کہا۔

بابے نے عینک کے دونوں شیشوں میں سے دیکھنے کی کوشش کی

پہچانا۔ صرف آواز کو پہچان کر کہا۔

"آ عنایت، صاحب سلامت ــــ" اور اُس کے دوسرے تینوں ساتھیوں کی دھندلی شکلیں پہچاننے کی کوشش کرتا ہوا اُس سے پوچھنے لگا ــــ "یہ ساتھ کون ہے تیرے؟"

"عنایت نے سب کا تعارف کرایا ــــ بابے نے سب کو عزت سے بٹھایا۔ بوٹے شاہ نے آگے بڑھ کر سٹول پر رکھی جلتی لالٹین کی بتی ذرا اونچی کر دی۔

"سُنایئے، کیسے آنا ہوا آج ــــ" بابے نے اپنی سفید مونچھوں میں سے شیریں مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"کام تو کوئی بڑا نہیں تھا تاؤ جی ــــ" علم دین بولا ــــ "ویسے ہی ہم نے کہا چلو چل کر سلام کر آئیں ــــ"

"اچھا پہلے بتایئے، دودھ کا گھونٹ پئیں گے ــــ؟"

"نہیں تاؤ جی! ــــ" عنایت بولا ــــ "کھانا کھا کر چلے آ رہے ہیں ــــ" اور پھر اپنے اصل مقصد پر آتے ہوئے بولا ــــ "یہ منشی جی اور مولوی جی کچھ باتیں آپ سے کرنا چاہتے تھے ــــ میں نے سوچا چلو چل کر ملا لاؤں ــــ"

"بڑے شوق سے باتیں کیجئے ــــ" بابے نے اپنا سر ذرا اُن کی طرف موڑ کر پوچھا ــــ "حکم کیجئے۔ مولوی جی ــــ"

"بابا جی کو شام سے ہی کم دکھتا۔ اس لئے ایک دفعہ پھر عینک کے شیشوں میں سے جھپکاتے ہوئے قریب بیٹھے ہوئے منشی اور

اور منشی عبدالرحمن کی طرف دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

مولوی کا رنگ کچھ سیاہی مائل زرد تھا۔ اور قد لمبا تھا۔ اُس کے جسم پر گوشت کے بجائے ہڈیوں کا وزن ہی زیادہ تھا۔ آنکھیں اندر دھنسی ہوئی۔ گال پچکے ہوئے۔ اور ہونٹوں کا رنگ ہلکا سیاہ تھا۔ اُس سے ظاہر تھا کہ یا تو یہ افیون وغیرہ کسی نشے کا عادی ہے یا تپ دق کا شکار۔ تنگ پائچہ کا چوڑی دار پاجامہ اُس کی ٹانگوں میں جھول رہا تھا۔ لمبی میلی اور چکٹی اچکن میں اُس کا ہڈیوں کا ڈھانچہ جسم بے میل نظر آتا تھا۔ ڈاڑھی صرف ٹھوڑی کے نچلے حصے پر ہی دکھائی دیتی تھی۔ باقی دونوں گالوں کا چمڑا ننگا اور کھردرا چمڑا بالوں سے صفاچٹ تھا۔ اُس کی لمبی گردن پر سیاہ کھرنچے پڑ گئے تھے۔ شاید بار بار کھرچتے رہنے کی وجہ سے اُس کی گردن پر مٹ میلے رنگ کی لکیریں بھی پڑ گئی تھیں گلے کی کنٹھی سے دو گنی اُبھری ہوئی تھی۔ جو بولنے پر اکثر ہلتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔

"میری عرض ——" مولوی صاحب کی زبان سے یہ الفاظ نکلے تھے کہ منشی عبدالرحمن بول اُٹھا۔

"ہم نے آپ کو اس لئے تکلیف دی ہے باباجی کہ موجودہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ کو آنے والے خطروں سے آگاہ کر دیں مذہبی کشمکش سے آپ واقف ہیں ہی، دن بدن خطرناک شکل اختیار کرتی جا رہی ہیں ——"

بابا بغور سُنتا رہا۔ اُس کے پاس جو افواہیں پہنچ رہی تھیں۔ وہ کس حد تک بے بنیاد نظر آنے لگیں اُسے بتایا گیا کہ سکول کا منشی

ایک دوسرے مولوی کی مدد سے گاؤں کے ماحول میں زہر گھل رہا ہے لیکن جب آج اُس نے دیکھا کہ وہی منشی اور مولوی آنے والے خطرے سے اُسے بچانے آئے ہیں۔ تو بابے کے شکوک کچھ دور ہو گئے۔

"آپ کی بہت مہربانی ہے منشی جی!" احسان ظاہر کرتے ہوئے بولا۔ "خواہ ہزار خطرے آئیں مجھے مکمل یقین ہے کہ اس گاؤں پر ان فسادات کا کوئی اثر نہ ہو گا۔ پھر جہاں آپ جیسے خیر خواہ موجود ہوں، وہاں تو ہمیں دودھ پی کر سونا چاہئیے۔"

"آپ کا خیال درست ہے بابا جی!" منشی اپنے میلے کوٹ کی اوپری جیب میں کھنسی ہوئی پنسل کے سرے کو ناخن کے ساتھ کھرچتے ہوئے بولا۔ "لیکن دیکھئے نا! پھر بھی آپ جانتے ہیں کہ مذہبی معاملات میں کسی کی طرف سے کسی قدر بھی غلطی ہو جائے، اُسکا سدھار نا مشکل ہو جاتا ہے۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا منشی جی!" بابا اس پُر اسرار بات پر بے چین ہو کر بولا۔

"مطلب صاف ہے تاؤ جی!" علم دین نے بات کا خلاصہ کرنے کے خیال سے کہا۔ "منشی جی صغرا ماسی کی لڑکی کی بابت کچھ کہنا چاہتے ہیں۔"

کھانا کھاتے ہوئے جیسے دانتوں تلے کوئی کنکر آجاتا ہے۔ اُسی طرح کی ناگواری محسوس کرتے ہوئے بابا نے پوچھا۔ "سیما کے بارے میں ؟"

"جی ہاں" کان میں ہوتی ہوئی کھاج کو اُنگلی سے دور کرتے ہوئے

عنایت نے کہا ــــ "یہ تو سارا گاؤں جانتا ہے بابا جی! کہ آپ اُنکی پرورش اپنوں کی طرح کر رہے ہیں، لیکن جہاں مذہب کا سوال آجائے وہاں یہی کہا جائے گا نہ ــــ بھئی اُن کا راستہ جُدا ہے، اور آپ کا جُدا ــــ کیوں کہ ہر کسی کو اپنا مذہب عزیز ہے۔"

منشی کے ابتدائی الفاظ نے جو بہت اثر بابے کے دل پر کیا تھا وہ دور ہونے لگا۔ لیکن دراصل بات کیا ہے وہ اب تک نہ سمجھ پایا۔ وہ چاہتا تھا کہ کہنے والے جلد از جلد پردہ ہٹا دیں۔

اُس کے کچھ پوچھنے سے پیشتر ہی منشی نے یہ کہہ کر بات صاف کر دی ــــ "ساتھ ہی لڑکی کی عمر بھی اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ وہ ہم مذہبوں کی سرپرستی میں رہے۔ فرض کیا کہ آپ، اُن کے خیر خواہ ہیں۔ لیکن لوگوں کی زبان پکڑی نہیں جا سکتی بابا جی! ایک بات کے ساتھ دس دس باتیں ملا کر کہتے ہیں۔ بس ہم آپ کے پاس یہی عرض کرتے آئے ہیں کہ اُن ماں بیٹی کو آپ اُن کے پرانے گھر میں بھیج دیجئے۔ آپ کے سر پر کب تک بوجھ بنے رہیں گے ــــ"

"میرے سر پر بوجھ ــــ!!" بابے کا مُنہ کھلا ہی رہ گیا۔

"ہاں بابا جی ــــ!" مولوی بولا ــــ "منشی صاحب درست فرما رہے ہیں۔ ساتھ میں جس کام میں بھی شرمندگی کے علاوہ اور کچھ نہ ملے وہ آپ کو کام کرنا ہی نہ چاہیے۔"

"شرمندگی! اور ــــ مجھے؟" بابے کی سانس تیز ہو گئی۔

"پہلے ہی کیا کم باتیں اُٹھ چکی ہیں بابا جی ــــ" علم دین انگوٹھے کے ناخن کو دانتوں سے کاٹتے ہوئے کہا ــــ "ساری گاؤں کا سر

نیچا کر دیا ہے اِس لڑکی نے۔"

"مگر ——" بابا گھبرا کر بولا —— "اس میں لڑکی کا کیا قصور ہے اور میرا......"

بات درمیان ہی ہی کاٹ کر عنایت بولا —— "قصور کی بات رہنے دیجئے بابا جی! آپ کے لحاظ سے بات بگڑی نہیں، ورنہ —— ورنہ آپ کے اس شہزادے ......" اور جملہ ختم کرتے ہوئے عنایت نے بوٹے شاہ پر نفرت آمیز نظر ڈالی۔"

"کون سی لڑکی ——" جملے کا نصف حصہ بوٹے شاہ کے حلق میں ہی تھا کہ بابا کڑکا —— "چپ رہ لڑکے! تیرا کوئی کام کوئی کام نہیں ہے بیچ میں بولنے کا۔ جا اپنا کام کر ——"

پھٹکار پڑتے ہی بوٹے شاہ زہر کا گھونٹ سمجھ کر غصے کو پیتے ہوئے وہاں سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔

بابے کا صبر بے قابو ہو رہا تھا۔ لیکن بزرگوں کی آن اور لڑکوں کی لحاظ نے ظاہر نہ ہونے دیا۔ جلد از جلد بات ختم کرنے کی خواہش سے وہ بولے۔

"چلیئے مان لیا۔ قصور میرا یا میرے بیٹے کا ہے۔ مگر براہِ کرم آپ مختصر الفاظ میں یہ بتا دیجئے کہ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں ——؟"

کہتے کہتے بابے کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اُسے خوف ہوا کہ اس کی زبان سے کوئی ناجائز بات نہ نکل جائے۔

"ہم دو باتیں چاہتے ہیں تا ئےجی ——!" علم دین بولا —— "ایک تو جس قدر جلد ممکن ہو، ہمیں کہئے کہ آپ کا مکان چھوڑ کر اپنے مکان میں

چلی جائیں اور دوسرے نسیم کو نکاح کے لئے رضامند کیجئے۔"
غصہ اور نفرت بھری سانس چھوڑتے ہوئے بابا بولا ـــــ "اچھا پُترو! اگر آپ اسی میں راضی ہیں تو میں آج ہی اُنہیں کہہ دونگا کہ اپنے گھر چلی جائیں۔ لیکن دوسری بات جو نکاح والی آپ نے کہی ہے، اُس کے ساتھ میرا کیا تعلق ہے۔ جب کہ اُن سے میرا کوئی رشتہ ہی نہیں تو نکاح کرنے والے جانیں یا آپ جانیں ـــ"
"یہ بات نہیں ہے تا دُجی ـــ!" عنایت بولا ـــ "خواہ آپ سے اُن کا کوئی بھی رشتہ نہ ہو۔ مگر یہ کام بغیر آپ کی رضامندی کے نہیں ہو سکتا۔"
"اس کا کیا مطلب ہے؟" بابا نے غصہ پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔
"اس کا مطلب یہ ہے ـــ" منشی بولا ـــ "کہ ہم صغرا کو پوچھ چکے ہیں۔"
"اُس نے کیا جواب دیا آپ کو ـــ؟"
"یہی کہتی ہے، بھئی بابا جی جانیں اور اُن کا کام جانیں ـــ میں اُن کی مرضی کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتی۔"
"خیر، بابا بولا ـــ" ایسا ہی سہی۔ میں بھی کیسے نہیں چاہتا کہ کام نہ ہو، میری بھی اسی فکر میں نیند حرام ہے کہ کون وقت ہوگا جو اس فرض سے سبک دوش ہوؤں گا ـــ لڑکا کوئی پسند کا مل جائے تو میں کہتا ہوں کہ دن چڑھنے سے پہلے یہ کام کر ڈالوں۔ مگر ...."
بات کاٹ کر علم دین بولا ـ "لڑکے کا ہم نے انتظام کر لیا ہے

تاؤجی! صرف آپ کے ہاں کہنے کی دیر ہے۔"

غصہ کا پارہ کچھ پارہ اترتا ہوا محسوس ہوا بابا یہ کہہ کر بولا۔۔۔ "اگر میری رضامندی کا آپ اسقدر خیال رکھتے ہیں تو مجھے لڑکا دیکھنے اور اس کے بارے میں کچھ جاننے کا حق ہونا چاہیئے۔"

"بڑے شوق سے دیکھیے۔۔۔" خوش ہو کر منشی بولا۔۔۔ "لڑکا تو آپ کو ابھی دکھا سکتے ہیں، بابا جی! یہ دیکھیئے" اور اس نے قریب بیٹھے ہوئے مولوی کی طرف اشارہ کیا۔ جو اپنی گردن کے کھرونچوں کو کھرچ کھرچ کر ان پر کھنچی مٹ میلی لکیروں میں اور اضافہ کر رہا تھا۔

"اللہ کے فضل سے۔۔۔" عنایت نے چٹکی لی۔۔۔ "بڑے گھر سے ہیں مولوی صاحب! تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ کسی بات کی کمی نہیں ہے ان میں۔"

"عینک کے موٹے شیشوں میں اس طرح بابے نے مولوی کو سر تا پا غور سے دیکھنے کے بعد ناپسندیدگی سے سر ہلا دیا۔

"اُسے خاموش دیکھ کر علم دین بولا۔۔۔ "کیا فیصلہ ہے آپ کا تاؤجی!"

بابے کو گویا سانپ سونگھ گیا۔۔۔ وہ مشکل سے یہی کہہ سکا۔۔۔ "اچھا غور کروں گا۔۔۔"

"غور کرنے کی اس میں کیا بات ہے بابا جی!" منشی نے گویا درخواست کی۔۔۔ "ترت دان مہا کلیان کیجئے۔ اور سر سے بوجھ اتار دیئے۔"

"منشی جی!۔۔۔" بابا کچھ کھینچ کر بولا۔۔۔ "پھر بھی لڑکی کی زندگی کا سوال ہے کوئی دال آٹے کا سودا نہیں ہے۔ کچھ سوچ سمجھ لینے دیجئے

سمجھے۔ ساتھ ہی گاؤں میں اور بھی لوگ ہیں جن کی رائے لینی ضروری ہے۔"

"حقارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ منشی بولا۔ "ان دقیانوسی لوگوں کی باتیں رہنے دیجیئے بابا جی!"

"مگر میں بھی تو ان ہی دقیانوسی لوگوں میں سے ایک ہوں، بلکہ یوں کہیئے سب سے بڑا دقیانوسی ہوں۔ کیوں کہ عمر میں سارے گاؤں میں بڑا ہوں۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہے۔" عنایت طیش میں آکر بولا۔ "کہ آپ اس رشتہ سے آپ انکار کر رہے ہیں۔"

"اس مرتبہ بابا اپنے غصہ کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ باہر والوں کی عزت اُس کے لئے ضروری تھی اس لئے وہ منشی اور مولوی کو تو کچھ نہ کہہ سکا۔ لیکن وہ دونوں تو اپنے ہی گاؤں کے لڑکے تھے۔ جو کئی دفعہ اپنے گالوں پر اُس کے چانٹے کھا چکے تھے۔ یہ بھی آج اس قدر گستاخ ہو کر تہذیب کو کھونٹی پر لٹکا چکے ہیں۔ آنکھیں نکال کر وہ عنایت پر برس پڑا۔ "سن اے چھوکرے! تو کس کے سامنے چپڑ چپڑ زبان چلا رہا ہے، مار کر چانٹا منہ دوسری طرف کر دوں گا، اگر زیادہ زبان چلائی تو نے۔" تو ہی بتا کہ تیری شادی کیا تیری ہی مرضی سے ہوئی تھی؟ تیری بہن فجاں، جس کی شادی پچھلے سال ہی ہوئی ہے کیا اُس کی شادی خاندان کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی؟ جا، میں نے انکار کیا۔ جو زور لگتا ہے لگا لے۔ کل گاؤں کے پنچوں کو بلا کر سارا معاملہ اُن کے سامنے پیش کر دوں گا۔ ہاتھوں میں جہنم ہے کہ میرے اوپر رعب گانٹھنے آیا ہے۔ چلا جا یہاں سے۔ ورنہ......" کہتے کہتے اُسے زور سے کھانسی آ گئی اور کافی دیر

تک اُس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔

مولوی اور منشی کا خیال تھا کہ بابے کی پھٹکار کے جواب میں دونوں نوجوان اُسے آڑے ہاتھوں لیں گے۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے بھلے ہی بابے نے عنایت کو پھٹکارا تھا۔ لیکن منشی اور مولوی انجان نہ تھے کہ دراصل انہیں ہی پھٹکارا جا رہا ہے۔ بے عزتی کی آگ سے دونوں کے دل کباب ہو گئے۔

"چلیے علم دین جی! آئیے عنایت خاں چلیں" مولوی صاحب نے یہ کہتے ہوئے اپنا پنکھے کی طرح جھولتا جسم لرزتی ٹانگوں پر کھڑا کیا اور اُس کے پیچھے پیچھے وہ تینوں بھی باہر نکل گئے۔

بابے کی آنکھوں کے سامنے تو عنایت کو بولنے کی ہمت نہ ہو سکی لیکن جیسے اُس کی پیٹھ بابے کی طرف ہوئی اور وہ دہلیز کے سے گذرنے لگا تو یک بیک اُس کے مُنہ سے نکلا۔ "اچھا دیکھا جائے گا۔ جو ہو گا۔۔۔"

...

Makhdum Library
Kamalpura
Malegaon Dist Nasik

Makhdum Library
★ Kamalpura, S N 15 ★
Malegaon (Dist Nasik)

کچھ دنوں کی چھٹیاں لے کر عزیز اپنے گاؤں میں آیا۔ اپنے عزیز و اقارب و گھر والوں کو فسادات کی لپیٹ سے بچانا ہی اُس کا خاص مقصد تھا۔

"شیما! کیا ہوا ہے تجھے؟ تو تو بالکل سوکھ گئی ہے؟"

شام کے دھندلکے میں گھر میں قدم رکھتے ہی عزیز نے سب سے پہلا سوال اپنی بہن سے کیا۔ اور نہایت فکرمند ہو کر۔

"کچھ نہیں بھائی جان!" نسیم نے اس کی بات رکھنے کے لئے کہا۔ "ہوا تو کچھ بھی نہیں۔ بس یوں ہی ذرا ——" اُس نے بہانہ تلاش کرنے کی ناکامیاب کوشش کی۔

عزیز نے اپنی ماں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ "فرض کیا آپ تو بیمار تھیں۔ مگر اسے کیا ہوا ہے؟ بھلی چنگی چھوڑ کر گیا تھا۔ اتنا چوڑا چکلا چہرہ تھا اس کا۔ اب تو جسم میں خون کا نام تک نہیں۔"

عزیز نسیم سے صرف تین چار سال بڑا ہے دیکھنے سے وہ پورے ڈیل ڈول کا جوان نظر آتا ہے، اُس کا رنگ اپنی بہن جیسا ہی گورا، آنکھیں موٹی اور چہرہ پُرکشش ہے۔ جس پر چھوٹی چھوٹی مونچھیں بہت خوبصورت دکھائی دیتی ہیں۔ اُس کی آنکھوں میں جھجک اور مردانہ اثر ہے چوڑی پیشانی اُس کے دل کی صفائی ظاہر کرتی ہے۔

اگرچہ عزیز زیادہ پڑھا لکھا نہیں۔ لیکن چھوٹی سی عمر میں ہی باہر نکل جانے اور شریف لوگوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے اُس کی بات چیت کا لہجہ پڑھے لکھوں سے کم نہیں۔ اُس نے خاکی نیکر اور براؤن رنگ کے فل سلیپر پہن رکھے تھے گلے میں انگوری سرج کا کوٹ اور سر پر ٹلیدار کُلّے پر سنوار کر باندھی ہوئی پگڑی تھی۔ جس کے دونوں چھور پوری شان کے ساتھ لہرا رہے تھے۔

"نسیما ــــ!" صغرا نے نسیم کو وہاں سے ہٹانے کے مقصد سے کہا ــــ "جا بیٹی! بھائی کے لیئے چائے بنا کر لا ــــ"

نسیم جب باورچی خانے میں چلی گئی تو صغرا نے تمام باتیں مفصل طور پر اپنے بیٹے کو بتانی شروع کیں۔ پہلے تو اُس کی خواہش ہوئی کہ لوٹ والے واقعہ کو چھپا لے۔ لیکن بعد میں یہ خیال کر کے کہ کہیں نہ کہیں تو یہ سُن ہی لے گا۔ معلوم نہیں کہ کیسا مرچ مصالحہ لگا کر کوئی اُسے سُنا دے اور غصہ میں آکر پھر نہ جانے یہ کیا کر بیٹھے۔ اس لیئے بڑے صبر و استقلال کے ساتھ وہ واقعہ بھی بیان کر دیا۔

سُن کر عزیز کے جسم میں آگ لگ گئی۔ لیکن ابھی بہت کچھ سُننا باقی تھا اس لیئے دل پر قابو کر کے سُنتا رہا۔ پھر ماں نے اُسے اُس

مولوی کی بابت بتایا اور ساتھ ہی یہ بھی کہ کل مولوی کے ساتھی اُسے کھجانے شاہ کا گھر چھوڑ دینے کے لئے کس طرح مجبور کرسکے اور دھمکیاں دے کر گئے تھے۔

جو کچھ بھی عزیز نے اپنی ماں سے سُنا یہ تمام باتیں فکر سے بھر دینے والی تھیں۔ نسیم اس قدر کمزور کیوں ہو گئی ہے، اُس کی بابت پوچھنے کی ضرورت نہ رہ گئی تھی ــــ ایک فکر جو اُسے یہاں کھینچ کر لائی تھی وہ تھی باباجی کو بتادوں کے خطرہ سے بچانا۔

جب اُس نے ماں کی زبانی اور پھر مفصل طور پہ یہ سنا کہ اُس مولوی اور سکول کے منشی کے بھڑاوا دینے سے گاؤں کے کئی نوجوان خون خرابے پہ آمادہ ہوتے جا رہے ہیں تو وہ اپنی ماں کی بیماری بھول گیا۔ نسیم کے مستقبل اور اس مولوی کی جوشیلی اور دھمکی بھری چیتاونیوں نے اُسے اور بھی متفکر بنادیا۔ اُس کے لئے سب سے پہلا کام کھجانے شاہ کے گھرانے کو گاؤں سے نکال کرلے جانا تھا۔

"لاکھ لاکھ لعنتیں ہیں ہم پہ ــــ" وہ تڑپ کر بولا۔ "جو ہمارے ہوتے ہوئے کوئی اُن کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھے ــــ چل ماں۔! ہم کچھ دنوں کے لئے راولپنڈی چلے چلیں۔ میں ابھی بابوجی سے جاکر کہتا ہوں۔ کہ جھٹ پٹ تیاری کرلیں۔ ہاں! میں اُنہیں یہاں نہ رہنے دوں گا۔ ایک منٹ بھی نہیں۔ میں نے ایک ترکیب سوچی ہے اُنہیں مسلمانی کپڑے پہنا کرلے جاؤں گا۔ پھر چاہے جب تک وہاں ٹھہرے رہیں کسی کو پتہ نہ لگے گا ــــ"

"جیسی تمہاری مرضی بیٹے ــــ!" ماں نے جذبات سے پُر لہجہ میں کہا۔

"اگر تو اتنا بوجھ اٹھا سکتا ہے تو اور چاہیئے ہی کیا ۔۔۔ ؟"

" تو میں ابھی حویلی میں جاتا ہوں ۔" کہتے ہوئے وہ چارپائی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

" چائے کا گھونٹ تو پی لے ۔" ماں روکتے ہوئے بولی ۔۔۔۔

" تھکا ہوا آیا ہے ۔۔۔ "

" کوئی بات نہیں ماں چائے کہیں چلی نہیں جا رہی ۔۔۔" کہہ کر وہ دروازے سے باہر نکلا ۔

لیکن اُسے بھانے شاہ کی حویلی تک جانے کی ضرورت نہیں ہوئی بابا خود اپنی لمبی لاٹھی کی مدد سے زمین ٹٹولتے ہوئے چلا آ رہا تھا۔

" باباجی سلام ۔۔۔" کہتے ہوئے عزیز بابے کے سینے سے جا لگا۔

" کون عزیز ؟ میرے لال ۔۔۔ !" بابا اُسے لرزتے بازوؤں میں کس کر جس طرح کوئی نادان بچہ کو چومتا ہے، اُس کا موتھ چومتا اور پیٹھ تھپتھپاتا ہوا بولا ۔۔۔ " ارے او' فرصت مل گئی تجھے نالائق ۔ کتنے خط ڈالے تھے تجھے ۔۔۔ !"

" کیا کرتا بابو جی ۔۔۔ !" بوڑھے بازوؤں میں آبِ حیات جیسی پدرانہ محبت کا مزا لیتے ہوئے عزیز نے کہا ۔۔۔ "کام سے تو فرصت ......"

" کام کا بچہ نہیں تو ۔۔۔" ممتا بھری دھندلی آنکھیں اُسکے چہرہ پر گاڑ کر بابے نے کہا ۔۔۔ " کنوئیں میں پڑیں تیرے کام !

ادھر اس بے چاری کی جان پر بنی ہوئی ہے ۔ اور اس بھڑوے کو

اپنے کاموں کی پڑی ہوئی ہے۔ خیر پھر بھی شکر ہے آ تو گیا۔"

عزیز نے بازوؤں میں تھامے ہوئے بابے کو اندر لا کر بٹھا دیا۔ صغراں نے سر کا پلو نیچے کرتے ہوئے کہا۔ "آیئے بھائیا جی! جی آیاں"

"کیا حال ہے تیرا بی بی!" بابے نے اپنی لاچاری ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "میں تو اب کسی لائق نہیں رہ گیا ہوں دروازے کے ساتھ دروازہ ہے اور یہاں تک آنے سے لاچار ہوں۔ آنکھیں بھی جواب دے رہی ہیں۔"

"بھائیا جی!" صغراں نے باعزت لہجہ میں کہا۔ "آپ نے کیوں تکلیف کی اتنی۔ عزیز آپ کی طرف تو چلا آ رہا تھا۔ آپ کے ہوتے ہوئے مجھے کس بات کی فکر ہے بھائیا جی! بچاری رحمن آدھی آدھی رات ڈول جاتی ہے ہر روز، تھوڑا سا ناخن بھی گرم ہوتا ہے تو سر پہ کھڑی ملتی ہے۔"

"ہرے رام ہرے رام۔" بابا موضوع تبدیل کرتے ہوئے بولا۔ "لڑکا آ گیا ہے، میرا دل چاہتا ہے، بے ایمان کو ٹھکاؤں دو چار۔ مگر تیرے لحاظ کی وجہ سے چپ کر گیا ہوں۔ یہ آج کل کے لڑکے اپنے ماں باپ کو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ پوچھو اس بے وقوف سے ماں تیری مرنے کے قریب ہے اور تجھے کام سوجھ رہے ہیں۔"

محبت آمیز اس اُلاہنے کو سن کر قریب بیٹھے عزیز کا دل باغ باغ ہو گیا۔ وہ نیچے نگاہوں سے بابے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "بابو جی معاف کیجئے۔ آئندہ ایسی غلطی نہ ہو گی۔"

"اچھا بہو رانی! ـــــ" صغرا کی طرف دیکھتے ہوئے بابا نے پوچھا۔ "سیما کدھر ہے ـــــ؟"

ماں کی بجائے بیٹے نے جواب دیا ـــ "وہ باہر رسوئی میں ہے۔ باپو جی! بلا لاؤں اسے۔؟"

"نہیں نہیں ـــــ" ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے بابا بولا ـــ "وہیں بیٹھے رہنے دے ـــ"

"کیوں بھا ئیا جی!" تکلیف کے ساتھ کھانستی ہوئی صغرا بولی "سیما کے بارے میں کچھ کہنا ہے؟"

"ہاں ـــ" وہ بولا ـــــ "آنا تو مجھے کل رات ہی تھا۔ لیکن آنکھیں تو کچھ کرنے نہیں دیتیں۔"

"آپ مجھے ہی بلا لیتے ـــ کتنی تکلیف ہوئی ہو گی آپ کو۔" "پگلی کہیں کی ـــــ" بابا بولا ـــ "تیری بھی کوئی حالت ہے باہر نکلنے کی۔ کہہ کر وہ اپنے مقصد کی طرف آیا ـــ" وہ آئے تھے تمہارے بھی گھر۔ کیا نام ہے اُن کا.....؟"

"ہاں آئے تھے ـــــ" بات سمجھ کر صغرا بولی ـــ "چودھری چکے کہاں سے ـــــ"

قریب بیٹھے عزیز کو پوچھ تاچھ کرنے کی ضرورت نہ تھی، کیوں کہ وہ اپنی ماں سے سب کچھ سن چکے تھے ـــــ

"بات قابو میں رہ کر کرنی چاہیئے۔ بہو رانی! میرے پاس بھی کل رات آئے تھے۔" بابا بولا۔

"کیا کہتے تھے۔؟" غصے سے تمتماتی صغرا نے پوچھا۔

"او کہنا ہی کیا تھا؟ جو تمہیں کہہ گئے وہی تھے ـــ بلکہ دھمکیاں الگ دے گئے تھے ـــ"

"دھمکیاں ـــ!" عزیز آپے سے باہر ہوتے ہوئے بولا ـــ "کیسی دھمکیاں باپو جی!"

اُس کے غصے کو محسوس کرتے ہوئے بابا نے کہا ـــ "کاکا! تو بیٹھا رہ خاموش، زیادہ تین پانچ کرے گا تو اُٹھا دوں گا۔"

عزیز خاموش ہو گیا۔

"ہاں ـــ" صغرا کی پسلیوں کے پیچھے سانس بول رہا تھا۔ "کیا کہتے تھے؟"

بابے نے رات کا پورا واقعہ شروع سے آخر تک سُنا دیا۔ لفظ بلفظ۔

"وہ کون ہوتے ہیں بڑے لاٹ صاحب جو مشورہ دینے آئے تھے ـــ" نہ چاہتے ہوئے بھی عزیز خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ بابے نے کچھ ڈانٹا تو وہ خاموش ہو گیا۔

"تم کون، کہتے لگائیں خواہ مخواہ ـــ" صغرا مشکل سے سانس لے کر بولی۔ "آئے ہیں ہمارے ہمدر دین کر۔ آج تک کسی نے پوچھا تک نہیں۔ اب اُن کی مذہبی حمیت جاگ اُٹھی ہے۔ بھلا پوچھے اُن سے کوئی کہ لڑکی کے ماں باپ مر گئے ہیں جو وہ لائے ہیں لڑکا تلاش کر کے۔ شکل نہ صورت، بندر کی مورت۔ دل تو میرا اُس وقت چاہ رہا تھا کہ اچھی طرح پلو سے باندھ کر بھیجوں۔ پھر میں نے سوچا، اندھے کتوں کو ہوا پہ بھونکنے دو۔ ہمارا کریں گے کیا۔ میں کہتی ہوں اس طرح آئے تھے

گویا کسی نواب کا پروانہ ہاتھ میں پکڑے ہوں۔ کہتا نہ مانوگی تو ہم یہ کر دیں گے، ہم وہ کر دیں گے۔ پوچھے کوئی......"

"کیا کریں گے؟" عزیز کے دبے ہوئے جوش کی بندش کھلنے والی تھی کہ بابے نے آنکھ کے اشارے سے گھُرک کر اُسے پھر خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔

"اچھا یہ تو ہوئی اُن کی فضول کی بک بک۔" بابا سنجیدہ ہو کر بولا۔ "جو اُنہوں نے دوسری بات کہی ہے، گھر چھوڑنے کے لئے مجھے تو اُس نے فکر میں ڈال دیا ہے۔ پتہ نہیں اُنہوں نے مجھ میں کیا کمی دیکھی ہے جو ایسی واہیات باتیں کہنے لگے ہیں میرے بارے میں لیکن خیر کسی کے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ اپنے دل کی بات کہتا ہوں بی بی! کھیئ مذہب کی بات رکھو ایک طرف۔ جس کا جو مذہب ہے اُسے مبارک ہو۔ باقی رہی بات ملی جلی، سو بی بی رانی سُن لے رحیم بخش مر گیا ہے۔ میں بھی نہ رہوں گا۔ مگر مرتے وقت وہ جو کچھ کہتا گیا تھا اُسے بھی زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ بوٹا اگر باپ کا بیٹا ہوا تو وہ بھی میرے بعد دل کہتا ہے اپنے باپ کے عہد کو نبھائیگا باقی رہا یہ گھر جس میں تم لوگ رہتے ہو۔ اگر کوئی کہتا ہے کہ یہ کھلنے کا گھر ہے تو یہ اس کی غلطی ہے۔"

گھر تمہارا ہے اور تمہیں اس کی مالک ہو — " بابا کہہ رہا تھا۔ "سچ کہتا ہوں بی بی۔ ابھی تک میرے سر سے رحیم بخش کا قرض نہیں اُترا۔ وہ اُس دن ادا ہوگا جس دن سیما کو ڈولی میں بٹھاؤں گا اور یہ لانائق لڑکا گھوڑی پر سوار ہوگا —"

"نالائق لڑکا ــــ" کہتے کہتے پیار بھری ایک نظر سے عزیز کی اور بلیے نے دیکھا! اور عزیز کی آنکھیں جو رحیم بخش کی یاد سے نم ہو گئی تھیں مسکرا اٹھیں۔

صغرا جواب میں کچھ نہ بولی۔ بولنا چاہتے ہوئے بھی نہیں۔ صرف اُس کے آنسو بتا رہے تھے کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔ احسان اور عزت کے مشترکہ جز تھے یہ آنسو ـــ

پچھلی کہی ہوئی باتوں کی طرف پلٹتے ہوئے بابا درمیان میں بول اُٹھا ـــ "ہاں میں کیا کہہ رہا تھا (ذرا سوچ کر) ٹھیک ہے میرا مطلب ہے بی بی رانی۔ بھئی اگر ان لوگوں کی تسلی اس بات میں ہے کہ تو اپنے مکان میں چلی جائے تو میں روکوں گا نہیں، دونوں گھر تمہارے ہیں۔ جس میں رہو چاہے اُس میں۔ اگر تم چاہتی ہو تو آج یا کل مزدوروں کو بلوا کر اُس کی مرمت کروا دوں گا۔"

"آپ اپنی بات اپنی زبان سے نہ کہیے بابا جی ـــ" صغرا کے گلے سے آواز لرز کر نکل رہی تھی ـــ "لوگوں کے دل میں جو آئے کہنے دیجیے۔ اگر اپنے سایہ تلے لیا ہے تو اب دھکا نہ دیجیے۔ میں اس سائے کو چھوڑ کر نہ جاؤں گی۔ خواہ کوئی میرے لئے بہشت کے دروازے ہی کھول دے۔ اللہ میری عمر بھی آپ کو دے۔ آپ ان بچوں کی خوشیاں دیکھیں۔"

"اچھا بابا جی ـــ" سلسلہ گفتگو ختم ہوتے دیکھ کر عزیز فوراً بول پڑا۔ "اب ایک دو باتیں میری بھی سُن لیجیے۔"

"تو بھی سنا لے، اگر ایسی ہی تجھے جلدی لگی ہے ـــ" بابا نے تے

ہنس کر اُس کی طرف دیکھا۔

"بابوجی!" عاجزی سے عزیز بولا۔ "میری کوئی بات اب تک آپ نے نہیں ٹالی۔ لیکن آج میری ایک اور بات ماننی پڑے گی۔"

"ماننے کی ہو گی تو کیوں نہ مانوں گا۔" بابے نے خاص توجہ دے کر اُس کی طرف تاکا۔

"میرا خیال ہے ابھی چند دنوں کے لئے ہم سبھی راولپنڈی چلے چلیں۔"

"اچھی بات ہے۔ اگر تو ان دونوں کا خرچ برداشت کر سکتا ہے۔ تو اور کیا چاہئے مجھے۔ لیکن تیری تنخواہ تو بہت تھوڑی ہے گذر کرے گا کیا؟ اور یہ بے چاری بھی کہیں آنے جانے کے قابل نہیں ہے۔"

"اکیلے نہیں جائیں گے۔ بابوجی!" بات خلاصہ کرتے ہوئے عزیز نے کہا۔ "آپ لوگ بھی ساتھ چلیں گے۔"

"بگلا کہیں کا۔" طنزیہ انداز میں بابے نے کہا۔ "کہیں لشکر اکٹھا کر کے لے جانا ہے؟"

"بابوجی!" عزیز نے عاجزی سے کہا۔ "میری بات نہ ٹالیئے نہیں۔ میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ اوپر سے گڑبڑ ہو رہی ہے، گاؤں میں بھی دنگے فساد شروع ہو گئے ہیں۔ کیا معلوم ہمارے گاؤں میں بھی کچھ گڑبڑ ہو جائے۔ آپ کو ضرور چلنا پڑے گا۔ بابوجی میرے ساتھ جلد سے جلد۔ میری واقفیت وہاں بہت سوں سے ہے۔ کسی بات کی آپ کو تکلیف نہ ہو گی۔

میں آپ تینوں کو مسلم لباس میں لے جاؤں گا ـــ"

"جیتا رہ بیٹا ـــ" اُس کی پیٹھ محبت سے تھپتھپاتے ہوئے بابا بولا۔ "ہم بوڑھوں کی لاٹھی اب تم اور بوٹا ہی پکڑو گے۔ اور تیری یہ بیمار ماں کیا گھر سے نکلنے کے قابل ہے؟ مگر دیکھ بیٹے! نصیب میں جو کچھ لکھا ہے وہ تو ہر حالت میں ہو کر رہے گا۔ میں تیری بات سن کر نہال ہو گیا ہوں بیٹے ـــ لیکن تو ہی بتا، ان بوڑھی ہڈیوں کو کہاں کہاں لادے پھرے گا۔ اگر مان جائیں تو اپنے بھائی بھاوج کو کچھ دنوں کے لئے شہر میں لے جا اور ساتھ ہی ساتھ سیما کو بھی شہر دکھلا۔"

"اور آپ بھائیا جی؟" صغرا پر گویا یک بیک لاٹھی کی چوٹ ہوئی۔ اُس نے بیقرار ہو کر پوچھا۔

"مجھے یہیں پڑا رہنے دو ـــ" بابا مکمل اعتماد و اطمینان سے بولا۔ "چار روزہ زندگی ہے، یہیں گذار لوں گا۔ اسی گاؤں میں پیدا ہوا تھا، دم بھی میری یہیں پر نکلے، یہی میری دلی مراد ہے ـــ"

"ڈوب کر مر جائیں ہم ـــ" صغرا بولی ـــ "گھر کی برکت چھوڑ کر ہمیں کیا کرنا ہے۔ جا کر بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہنے سننے کی۔"

سلسلہ گفتگو ابھی نہ معلوم کہاں پہنچتا کہ باہر گلی سے آتے شور نے سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ـــ "ایک ساتھ کئی آوازیں آئیں، ساتھ کے گاؤں پر حملہ ہو گیا ـــ لوٹ مار ـــ قتل ـــ"

صغرا جو پہلے ہی در دے سے نڈھال تھی، اس آواز کو سنتے ہی کھڑی ہو گئی اور فوراً بعد اُکھڑے ہوئے سانس لیتی ہوئی چارپائی پر لیٹ گئی۔

●●●

دیکھتے ہی دیکھتے جنگل کی آگ کی طرح فسادات کی آگ ہر سمت دھڑک اٹھی ہندو سکھوں کی تعداد مسلمانوں کے مقابلہ میں آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ اس لئے ان لوگوں کی بڑی بڑی حویلیوں اور بھری ہوئی دکانوں کو لوٹ لیا جاتا پھر آگ لگا دی جاتی۔ نوجوانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا اور نوجوان لڑکیوں کو اغوا کر لیا جاتا جس طرف دیکھو ہاہا کار تھا۔

جکڑی گاؤں ابھی تک محفوظ تھا لیکن کب تک محفوظ رہ پائے گا کسی کو کوئی بھروسہ نہ تھا۔ جبکہ آس پاس کے گاؤں کے رہنے والے ٹڈی دل کی طرح منڈلا رہے تھے۔ اور خون کی ہولی کھیل رہے تھے۔

رات تو خیریت سے گذر گئی۔ گاؤں کے مسلمانوں نے رات بھر کھتریوں کے مکانوں پر پہرا دیا۔ لیکن دن چڑھتے چڑھتے خطرے میں اضافہ

ہوتا گیا۔ خبریں پہنچنے لگیں کہ قصبہ فتح جنگ کی سمت سے کئی ہزار لیٹروں کا ایک بہت بڑا گروہ اُس طرف بڑھا چلا آ رہا ہے جنہوں نے آدھی رات کے وقت چکری، ڈھیری، کولیاں وغیرہ کئی درجن گاؤں لوٹنے کا پروگرام بنایا ہے۔ لیٹروں کے پاس نہ صرف سو سے زیادہ بندوقیں ہیں۔ بلکہ ملٹری کی ایک ٹکڑی بھی اُن کی مدد کر رہی ہے۔

گاؤں کے مکھیا چودھری فضل کریم اور اُس کے ساتھیوں کو جب اپنے پڑوسیوں کی حفاظت کا کوئی دوسرا راستہ نظر نہ آیا۔ تو وہ اس فیصلے پر پہنچے کہ اُنہیں کسی محفوظ کیمپ میں پہنچا دیا جائے۔ فساد شروع ہونے کے بعد اس طرح کے کیمپ کئی جگہ کیمپ کھل گئے تھے۔

وہ لوگ جب باباجی کے گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ باباجی صغرا کے مکان پر ہیں۔ وہاں جا کر اُنہیں کچھ اور دیکھنے کو ملا۔ صغرا بے ہوش پڑی تھی اور باباجی اُسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے، بوٹے شاہ اور اُس کی بیوی رکمن، عزیز اور نسیم بیمار صغرا کی چارپائی کو گھیرے کھڑے تھے۔ صغرا اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہی تھی۔

کافی دیر تک بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ لیکن باباجی اور اُن کا گھرانہ اپنی ضد پر اڑا رہا تو اُن کے سامنے کسی کی پیش نہ گئی۔ اُن لوگوں کا بار بار یہی کہنا تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ عزیز کی ماں کو بستر مرگ پر چھوڑ کر وہ گاؤں سے چلے جائیں۔

آخر چودھری نے اپنے ساتھیوں کو مناسب ہدایات دے کر گاؤں میں بھیج دیا۔ تاکہ کھتری گھرانوں کا سامان بندھواتے میں اُن کی مدد کریں۔ وقت کم تھا اور خطرہ بڑھ رہا تھا۔ باباجی اور اُن کے گھر والوں کو

یہاں سے نکلنا ہی ہوگا۔ خواہ وہ کتنی ہی رکاوٹیں ڈالیں ——
چودھری اور اس کے ساتھیوں نے یہ فیصلہ کر رکھا تھا۔

•••

Makhdum Library
★ Kamalpura, S N 15 +
Malegaon (Dist Nasik)

Makhdum Library
★ Kamalpura, S N 15 +
Malegaon (Dist Nasik)

Makhdum Library
★ Kamalpura, S N 15 ★
Malegaon (Dist Nasik)

شام ہوتے ہوتے سہاں ندی کے کنارے آباد وہ چھوٹا سا گاؤں ایک چھوٹے سے رفیوجی کیمپ میں تبدیل ہو گیا۔ گاؤں بھر کے کھتریوں کا سارا سامان باندھ کر اور لاد کر گلاب سنگھ کی دھرم شالہ میں لاکر رکھ دیا گیا۔ اور ساتھ ہی ہندو گھرانوں کو بھی۔ پتھر کی اونچی دیواروں اور مضبوط دروازے کی وجہ سے یہ مقام دوسرے مقاموں کی بہ نسبت کہیں زیادہ محفوظ تھا۔

رات ہوتے ہوتے قریب کے گاؤں کے بہت سے ہندو گھرانے بھی وہاں آ پہنچے۔ شاید اس خیال سے کہ ایک تو یہاں کے مسلمان ہندوؤں کی حفاظت کا عہد کر چکے ہیں۔ دوسرا یہ کہ یہ دھرم شالہ ہر لحاظ سے محفوظ ہے اُنہیں یہ بھی پتہ چل گیا تھا۔ کہ جمکیری گاؤں میں اُس کی حفاظت کے لئے ملٹری بھی آ چکی ہے۔

صبح سے ہی چودھری نے اپنے لڑکے کو ایک اچھی گھوڑی دے کر

ملٹری کیمپ میں بھیج دیا تھا تاکہ ان لوگوں کو گاؤں کے نکالنے کے لئے کچھ ٹرکوں کا انتظام ہو سکے۔

اُس کے علاوہ چودھری نے ایک سیاسی چال چلی جو نہایت کار آمد ثابت ہوئی۔ گاؤں کے چند لوگوں کے ذریعہ اُس نے علاقہ میں یہ افواہ پھیلا دی کہ چاپری میں مشین گنوں سے لیس ملٹری کے نوجوان آ پہنچے ہیں۔ جس کا فائدہ یہ ہوا کہ دوسری رات بھی بخیریت گذر گئی۔ اور لٹیروں نے اِدھر کا رُخ نہ کیا۔ چوں کہ افواہ غلط تھی اس لئے اُس کا اثر پائیدار نہ رہ گیا۔

گلاب سنگھ کی دھرم شالہ میں کل ملا کر تقریباً دو سو مہاجرین ہو چکے تھے۔ جن کے کھانے کے لئے گاؤں والوں نے کافی راشن جمع کر رکھا تھا۔

جب لوگوں نے سُنا کہ اُنہیں نکالنے کے لئے ملٹری ٹرک آ رہے ہیں تو سب کے چہروں پر اُمید کی کرن دوڑ گئی۔ لیکن اُس کے فوراً بعد ایک خبر نے اُنہیں سخت نا اُمید کر دیا کہ لٹیروں کے تین بڑے گروہ اسی طرف بڑھے چلے آ رہے ہیں۔

صغرا کی حالت لمحہ بہ لمحہ گرتی چلی جا رہی تھی۔ اُس کو لا کر چودھری کے گھر رکھا۔ نسیم کا قدم ایک ماں کی چارپائی کے قریب اور دوسرا دھرم شالہ میں رہتا تھا۔ رفیو جی ٹھہرے ہوئے تھے، اپنے دھرم پتا کے حکم کے مطابق دونوں بھائی بہن اور بوٹے شاہ اُن کی خدمت میں جُٹے ہوئے تھے۔ بابا کا کام یہ تھا کہ وہ باری باری سبھی پریشان حال اور نا اُمید مرد عورتوں کے پاس جا بیٹھتا اور اُنہیں تسلی دیتا۔ ساتھ ہی اُنہیں

صلاح سے یُر نصیحتیں بھی کرتا۔ اب جبکہ موت کا خطرہ سر پر آچکا تو اس کے خیال میں سب سے مناسب کام یہی تھا کہ ان لوگوں کو تسلی دے سکے صبح سے دوپہر سے پھر شام ہوئی۔ لیکن ابھی تک کسی بس یا ٹرک کی آواز سُنائی نہ دی۔ گردوارے کے اوپر کی چھت پر چڑھ کر کنگوروں کے پیچھے چھپے ہوئے لوگ رہ رہ کر سڑک کی سیدھ میں جھانک رہے تھے۔ لیکن سہان کی ایک لمبی اور چمکیلی لکیر کے علاوہ انہیں کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔

آج کی رات ایک خوفناک اور خطرناک رات سمجھی جارہی تھی۔ کیوں کہ ڈھنڈھیال کی طرف سے آرہے لٹیروں کے بڑے گروہوں کے آنے کی انہیں خبر مل چکی تھی۔ اور سب کا خیال تھا اگر اس سے پہلے ملٹری کی مدد نہ پہنچی تو ان بدنصیبوں کو اس مصیبت سے کوئی نجات نہ دلا سکے گا۔

رات کے گیارہ بجے تک بابا بوٹے شاہ اور عزیز صغرا کی چارپائی کو گھیرے کھڑے رہے لیکن اُس کی حالت میں کوئی خاص سدھار نہ ہوا۔

رات کا آخری حصہ اس پورے کینبے نے جاگ کر کاٹا۔ گاؤں کے پچاس ساٹھ مسلمان ساری رات بلّم کلہاڑے لیئے گردوارے اور کھتریوں کے مکان کے آس پاس پہرا دیتے رہے۔

وہ رات بھی خیریت سے گذر گئی۔ اور صبح ہوتے ہی گاؤں کے لوگوں کے کانوں نے ایک ایسی آواز سُنی جس سے اُن سب کی جان میں جان آگئی۔ یہ موٹروں کی آواز تھی۔ پھر کیا تھا سارا گاؤں، کیا کھتری

اور کیا مسلمان گاؤں سے باہر اُٹھ کر بھاگا۔ سہال کے پار سڑک پر ٹرک کھڑے ہوئے تھے۔

ملٹری کے چار چار سپاہیوں کے ساتھ تین ٹرک موجود تھے۔

آفیسر نے گاؤں والوں کو کہا۔

"جلدی سے جلدی سوار ہو جائیے، جتنے بھی آدمی ان میں آسکتے ہیں ــــ"

"گردوارے میں ہلچل پھیل گئی، جلدی جلدی بستر اور سامان بندھنے لگے۔ ادھر چودھری فضل کریم کے گھر میں بھی یہی حالت تھی، چودھری اور اُس کے ساتھی جلدی سے بابے جی کا سامان اُٹھا کر سڑک کی طرف لے چلے۔ لیکن جیسے ہی بابا صغرا کے پاس سے اُٹھ کر باہر نکلا اُس نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو روکتے ہوئے نوجوانوں کے سروں سے ٹرنک اور گٹھریاں اُتروا لیں۔

"کیوں بابا جی ــــ؟" چودھری نے آگے بڑھ کر پوچھا ــــ "لے جاتے کیوں نہیں دیتے اُن کو؟ اُدھر جگہ رُک جائے گی۔ اگر ڈھیل کی تو؟"

"بابا بولا ــــ "چودھری جی! اُن سبھی کو سوار ہو جانے دیجئے۔ بعد میں دیکھا جائے گا ــــ"

"کیوں بیوقوفوں جیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟" چودھری نے جواب دیا ــــ "سارے آدمی کہیں ان تینوں ٹرکوں میں سما سکیں گے؟"

"تو پھر ہم ابھی نہیں جا سکتے ــــ"

"کیوں بابا جی؟"

"پہلے جب تک وہ سبھی نہیں چلے جاتے، تب تک ہم میں سے

کوئی نہیں جائے گا۔ اور دوسری طرف صغرا آخری سانسیں لے رہی ہے
چودھری جی! آپ لڑکوں کو فوراً اُن لوگوں کی مدد کیلئے بھیجدیجئے۔
جتنے زیادہ سے زیادہ آدمی چڑھائے جا سکتے ہیں چڑھا دیئے جائیں۔
تینوں ٹرک بھر گئے۔ نیچے سامان، اِدھر سواریاں۔ لیکن دو سو سواریاں
تینوں ٹرکوں میں کیسے آ سکتی تھیں۔ بڑی مشکل سے ٹھونس ٹھانس کر
یہاں تک کہ کئی تنگڑے رفیوجی ٹرک کے مڈگارڈوں پر لٹک پکڑ کر
کھڑے ہو گئے۔ ہر ایک یہی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کسی طرح اپنے سامان
اور اپنے کُنبے کے ساتھ چڑھ جائے۔ بڑی گڑبڑ ہوئی۔ اور آخر یہی ہوا
کہ جو طاقت ور تھے وہ کسی طرح گھُس گھُسا کر سوار ہو گئے اور کمزور
چڑھنے سے رہ گئے۔ حالانکہ جمعدار نے کافی یقین دیا کہ اُس کے
پیچھے پیچھے دو اور ٹرک آ رہے ہیں جو گھنٹے بھر میں یہاں پہنچ جائیں گے
لیکن اتنا صبر کیسے تھا جبکہ سبھی جانتے تھے کہ گھنٹہ کیا منٹوں میں ہی
قیامت ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

ٹرک چلے گئے اور باقی رفیوجی گوردوارے کی چار دیواری کے
پیچھے بیٹھ کر انتظار کرنے لگے ۔۔۔۔

تاریک و سیاہ خوفناک رات، بادلوں سے گھرا آسمان اور لرزا دینے والی تیز ہوا آندھی کی رفتار سے چل رہی تھی۔ بابا سجانا کی بغیچی میں کئی انسانی سائے ہل ڈل رہے تھے، اُن میں رہ رہ کر اکثر کھُسر پھُسر بھی ہو جاتی لیکن ہوشیاری کے ساتھ۔ وہاں لالٹین کی روشنی بھی تھی۔ لیکن اُس کی لَو بہت ہی مدھم تھی۔ یہاں روشنی کی موجودگی گویا موت کو دعوت دینے کے برابر تھا۔

اُنہی لوگوں میں بابا سجانا کا کنبہ بھی تھا۔ اور عزیز، نسیم، چودھری اور گاؤں کے اور لوگ بھی موجود تھے۔

چاند کا ننھا سا ٹکڑا ابھی تک آسمان پر باقی تھا جس کے گم ہونے میں دیر نہ تھی۔ اور اُس کے ڈوبنے پر یہ قافلہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہونے والا تھا۔ ورنہ یہ خوف تھا کہ یہ لوگ اس علاقہ کے لٹیروں کی نظروں میں پڑ جائیں تو جان کی خیریت نہیں۔

قافلہ سے تقریباً ۲۰ گز کے فاصلہ پر کچھ لوگوں میں بحث مباحثہ ہو رہا تھا۔ وہ کھسپھساتی آوازیں بول رہے تھے۔

"تو ٹھیک کہتی ہے نسیم ——" چودھری سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا —— "اگر اتنی بات تو مان لے تو اس میں تیرا ہی بھلا ہے"

جواب دینے کے بجائے نسیم سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ بہن کے اس غم سے متاثر ہو کر عزیز نے جواب دیا۔

"چاچا جی! اب ہمیں نہ روکیے۔ اماں کو خدا کے گھر جانا تھا تو چلی گئی۔ باقی رہا سوال جنازے کا تو کندھا دینے کے لئے آپ موجود ہیں۔ لیکن یہ تو سوچیے۔ خدا نہ کرے اگر راہ میں بابو جی کے گھر والوں کو کچھ ہو گیا تو ——؟"

"میں یہ تو نہیں کہتا بیٹا ——" چودھری بولا —— "تمہیں تو میں نہیں روکتا۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ نسیم ......"

"نسیم ایک دم بول اٹھی —— "میری فکر نہ کیجیے چاچا جی! اور راولپنڈی کچھ دور نہیں ہے ——"

آخر چودھری کو ہار ماننی پڑی۔

آسمان میں چاند کا آخری ٹکڑا بھی گم ہو چکا تھا۔ گھنا اندھیرا پھیلتے ہی سفر کی تیاری شروع ہو گئی۔ فالتو اسباب وہیں دھرمشالہ میں چھوڑ دیا گیا۔ ضروری سامان جسے آسانی سے ساتھ لے جایا جا سکتا تھا۔ کندھوں پر اٹھا لیا گیا۔ پھر بھی سب کے پاس اپنے سے دوگنا تین گنا اسباب تھا۔ انسان اپنے موہ کو کس طرح چھوڑ سکتا ہے؟ جن چیزوں کو وہ عمر بھر جٹاتے میں لگا رہا ہو انہیں چھوڑتے ہوئے

کس قدر دُکھ ہوتا ہے اس کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔

اُن لوگوں کی اس خطرناک حالت کو دیکھ کر گاؤں کے چند نوجوانوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے عزیز پڑوسیوں کو شہر کے سرکاری کیمپ میں پہنچا کر لوٹیں گے۔ اس لیے باقی سامان اُنہوں نے اپنے کندھوں پر اُٹھا لیا۔ باباجی نے اس گفتگو میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ وہ بالکل کنارہ کشی کئے بیٹھے مسلسل یہی لفظ گنگناتے رہے۔

رام رام کہتے رہو، نت ہے رہو من دھیر
کارج آپ سنواریں گے، رامچندر رگھو ویر

اور اُن کی یہ محویت اُس وقت ختم ہوئی جب نسیم نے آکر اُن کا کندھا جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"چلیئے باپوجی ——!"

کچھ دیر یہی بحث ہوتی رہی کہ کس راستے سے چلا جائے پہلے فیصلہ کیا گیا کہ راولپنڈی والی سڑک پر چلا جائے۔ لیکن اس راستہ کی بہ نسبت فتح جنگ کے راستہ کو ہی محفوظ سمجھا گیا۔ اول تو اس راستے میں اونچی اونچی پہاڑیاں اور گہرے کھڈوں کی آڑ رہے گی اور دوسرے یہ بھی خیال تھا کہ کسی طرح بھی ممکن ہو سکے گا دن چڑھنے سے پیشتر اُنہیں جلّے نام کے قصبے میں پہنچا دیا جائے گا۔ جہاں ایک چھوٹا سا سرکاری ریسٹ کیمپ تھا اور ساتھ ہی تھانہ بھی تھا۔ اس کے علاوہ اُنہیں یہ بھی معلوم تھا کہ اس علاقہ سے بھاگے ہوئے ہندو سکھ پہلے ہی کافی تعداد میں جلّے میں جمع ہو رہے ہیں اور اُنہیں نکالنے کے لئے ملٹری کا خاص انتظام ہے۔

بارہ یا ساڑھے بارہ بجے کا وقت ہوگا جب سبھی چلنے کے لیئے تیار ہو چکے تھے گاؤں سے نکل کر ابھی کچھ دور ہی بڑھے تھے کہ اُنہیں کچھ فاصلے پر انسانی سائے نظر آئے۔ پہلے تو سبھی کو دشمن ہونے کا شک ہوا۔ لیکن قریب آنے پر معلوم ہوا کہ یہ اپنے ہی آدمی ہیں۔

چودھری فضل کریم اپنے سر پر دو ٹرنک اُٹھائے ہوئے تھا۔
"لیجئے بابا جی!" آگے آ کے چودھری بولا۔ "آپ کے زیور اور نقدی جو کچھ بھی ملا اکٹھا کر کے میں نے ٹرنک میں بند کر دیئے ہیں کچھ ریشمی کپڑے بھی ہیں ——" پھر وہ نسیم سے بولا۔ "یہ چھوٹا ٹرنک تمہارا ہے، یہ بھی اُٹھا لایا ہوں —— کھول کر میں نے نہیں دیکھا۔ میرا خیال ہے کپڑے وغیرہ سبھی کچھ اس میں ہوں گے ——" اور روٹیوں کی پوٹلی عزیز کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہنے لگا۔ "اس وقت اور تو کچھ بن نہیں سکا۔ صرف پانچ دس پراٹھے اور تھوڑی سی شکر باندھ دی ہے، میں نے سوچا شاید راستے میں کھانا ملے نہ ملے۔"
اس کے بعد اپنے بیٹے فتح سے کہنے لگا۔ "فتے! بابے کے ٹرنک کا خیال رکھنا اس میں بیس پچیس ہزار کا مال ہے۔"

اس ہدایت کے بعد بڑا ٹرنک فتح نے اپنے سر پر اُٹھا لیا اور چھوٹا نسیم والا ایک دوسرے نے ——

چلنے والے اُتاؤلے ہو رہے تھے۔ لیکن اِدھر بابے اور چودھری کے بازو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح جکڑے ہوئے تھے کہ چھوٹنے کا نام ہی نہ لے رہے تھے۔ بڑی مشکل سے چودھری کے منہ سے یہ لفظ نکلے ——

"اچھا جلیئے، اللہ کے حوالے، خداوند کریم چاہے تو ایک مرتبہ ہم پھر ملیں گے۔
اُن کے ان الفاظ کو سُن کر سب کی سسکیاں پھوٹ پڑیں۔

• • •

Makhdum Library
* Kamalpura, S N 15
Malegaon (Dist. Nasik)

Makhdum Library
* Kamalpura, S N 15
Malegaon (Dist. Nasik)

Makhdum Library
★ Kamalpura, S. N. 15 ★
Malegaon (Dist. Nasik)

رات نصف گذر چکی تھی اور نصف باقی تھی۔ آسمان پر چھائی ہوئی گھٹاؤں نے رات کے اندھیرے کو اور بھی گہرا بنا دیا تھا۔ سرد ہوا کے ساتھ ہلکی ہلکی بوندیں بھی پڑنے لگیں تھیں۔

چکری سے نکل کر یہ مہاجرین اپنے محافظوں کے گھیرے میں چلتے ہوئے تلہ گنگ کی سڑک پر چلنے لگے۔ اُن کے ساتھی رُک رُک کر اِدھر اُدھر کی ٹوہ لیتے تھے۔ نظر تو کسی کو کچھ بھی نہ آتا تھا۔ اُنہیں پتہ تھا کہ رات کے وقت لٹیروں کے پاس مشعلیں ہوتی ہیں۔ وہ بار بار رُک جاتے اور جب اُنہیں اچھی طرح تسلّی ہو جاتی کہ خطرے کی کوئی بات نہیں تو آگے بڑھتے۔

بابے کی تکلیف اس وقت سب سے زیادہ ناقابلِ برداشت تھی۔ اوّل تو آنکھوں سے کچھ دکھائی نہ دینے کی وجہ سے وہ ٹھوکریں کھاتا ہوا چل رہا تھا۔ دوسرے سردی زیادہ ہونے کی وجہ سے اُس کے

پاؤں اُس کا ساتھ نہ دے رہے تھے۔

نسیم نے اپنی چھوٹی سی گٹھڑی ایک دوسرے شخص کو پکڑا دی اور خود بابے کو ہاتھ اپنے کندھے پر لے کر چلنے لگی۔ دوسری طرف سے عزیز نے اُسے سہارا دیدیا۔

سبھی خاموشی سے چلے جارہے تھے۔ بولنا یا کھٹکھٹانا منع تھا۔ ابھی دو میل سفر بھی طے نہ ہوا تھا کہ پچھلی طرف سے آتی ہوئی روشنی نے سب کی جان خشک کر دی۔ سبھی کو یقین ہو گیا کہ پیچھے سے لٹیروں کا گروہ آرہا ہے۔

اُس وقت وہ لوگ جہاں سے گذر رہے تھے قریب ہی ایک اونچی چٹان تھی۔ اور کوئی صورت نہ دیکھ سب نے اُس کے پیچھے چھپ جانے کا فیصلہ کیا اور وہ سڑک چھوڑ کر اُسی طرف چل پڑے۔

چٹان سڑک کے بالکل قریب ہی تھی۔ جہاں بیٹھ کر سڑک کا بڑا حصہ دیکھا جا سکتا تھا۔ اُدھر قدموں کی آوازیں برابر قریب آتی جا رہی تھیں۔ اندھیرے میں ہی اندازہ لگا لیا گیا کہ آنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ کچھ دیر بعد اُنہیں اندھیرے میں ایک بادل کے جیسا یہ گروہ آتا ہوا دکھائی دینے لگا۔ تو اُن میں سے کئی ایک کا خیال تبدیل ہو گیا۔ کہ یہ چور لٹیرے نہیں ہیں۔ کیونکہ نہ تو ان کے پاس نہ تو مشعلیں تھیں اور نہ یہ لٹیروں کی طرح شور و غل مچا رہے تھے۔

جب وہ لوگ اور قریب آ گئے تو سب کو یقین ہو گیا کہ وہ بھی اُنہیں کی طرح رفیوجی ہیں۔ وہ لوگ جب عین اُس چٹان کے قریب سے گذر رہے تھے تو ایک آواز سُنائی دی۔

"تو کچھ فکر نہ کرماسی! اُن کی ایسی کی تیسی جو آپ کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھیں۔"

جواب میں ایک آہستہ سی آواز آئی "معلوم تو ایسا ہوا تھا کہ ہمارے آگے آگے کوئی گروہ گذرا ہے۔ پتہ نہیں کہ کدھر غائب ہو گیا۔"

"خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" کہتے ہوئے اُس پارٹی کے سبھی لوگ چٹان کے پیچھے سے نکل آئے۔ اور سڑک پر آ گئے۔ جیسے ہی دوسری پارٹی نے جس میں زیادہ تعداد عورتوں کی تھی اُنہیں دیکھا تو چیخنے چلانے لگیں۔ لیکن شیخ اور دو تین آدمیوں نے اُنہیں ساری بات بتائی تو اُن کی جان میں جان آئی۔

دونوں پارٹیاں اب مل کر چلنے لگیں۔ اِدھر کی پارٹی نے دیکھا کہ اُن کی تعداد تقریباً پینتیس تھی۔ جس میں تقریباً دس عورتیں اور نوجوان لڑکیاں۔ دس کے قریب بچے اور پانچ چھ مرد تھے۔ جسے چاروں طرف سے بارہ مسلح مسلمانوں نے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔

کئی یوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ یہ قافلہ سچالہ سے آیا تھا۔ چکری کے محافظوں کی طرح اُس گاؤں کے مسلمانوں نے بھی اُنہیں کسی محفوظ مقام پر پہنچانے کے لئے اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھ لی تھیں۔

ملا جلا سفر دونوں قافلوں کے لئے خوش گوار اور با اطمینان محسوس ہونے لگا۔ خطرہ کچھ اس وجہ سے بھی کم ہو گیا کہ وہ خطرے کے مقام سے کچھ آگے نکل آئے۔ دوسرا یہ کہ سب ملا کر تیس کے قریب لٹھ بدت

اُن کے ساتھ تھے۔ جو کسی بھی تگڑے گروہ کا آسانی مقابلہ کر سکتے تھے۔

اُجلے پاکھ کی ریتج ہونے کی وجہ سے رات تقریباً تاریک تھی۔ اس پر بھی اوپر بادلوں کے چھائے ہونے کی وجہ سے رات اماوس کی رات بن گئی تھی۔ قافلہ چلا جا رہا تھا۔ اور اُس کے محافظ مستعدی سے اِدھر اُدھر دائیں بائیں سراغ لیتے ہوئے قدم بڑھا رہے تھے۔

عورتیں اور بچے بُری طرح تھک گئے تھے۔ سبھی کی خواہش تھی کہ سامنے پہاڑی کے بائیں بازو پر سرغالی کی گپھا میں پہنچ کر گھڑی بھر آرام کر لیں۔ یہ گپھا کئی فرلانگ لمبی اور کافی چوڑی تھی۔ اس میں پانی کے کئی سوتے تھے۔ ویسے گپھا میں ایسے ایسے مقام بھی تھے جہاں چھپے آدمی کو رات کو تو درکنار دن میں بھی تلاش کرنا مشکل تھا۔

پہاڑی جب آدھے میل سے کم رہ گئی۔ تو بارش نے زور پکڑ لیا۔ دیکھتے دیکھتے بارش زوروں سے ہونے لگی۔ بادل اور نیچے جھک آئے جن کی وجہ سے تاریکی اور گہری ہو گئی۔

قدموں میں اور تیزی آ گئی۔ جس آدمی میں چلنے کی طاقت نہ تھی اُس نے بھی دوڑنا شروع کر دیا۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ اُن پر سبھی پر بوجھ لدا ہوا تھا۔ جس سے دوڑنا مشکل ہو رہا تھا۔ کمزوروں کی پوٹلیاں طاقت وروں نے تھام لی تھیں۔ اس طرح گرتے پڑتے آگے بڑھنے لگے۔

یکایک قافلہ میں سے ایک آواز سُنائی دی۔ جس سے سبھی

خوفزدہ ہو اُٹھے ۔۔۔ "وہ دیکھو سامنے پہاڑ کے کنارے سے کون چلے آرہے ہیں ۔۔۔"

سب کی نظریں پہاڑ کے اُس حصّے پر جا لگیں، جدھر اشارہ کیا گیا تھا۔ کچھ بھی صاف نظر نہ آرہا تھا۔ اس کے لئے بجلی کے چمکنے کا انتظار کرنے لگے۔

بجلی کوندی تو سب کی نگاہیں اُسی پر لگی ہوئی تھیں، پہاڑ ایک دھندلی اور ٹیڑھی میڑھی لکیر نظر آرہی تھی کچھ ہلتی اور سانپ کی طرح رینگتی ہوئی۔

ایک اور آواز آئی ۔۔۔ "لیٹروں کی ایک بہت بڑی بھیڑ۔۔۔" سُن کر سبھی کو اپنی اپنی پڑ گئی ۔۔۔ ساتھی محافظ حالانکہ تسلّی دے رہے تھے۔ لیکن بیکار۔ سبھی کا صبر چھوٹ گیا۔ یہاں تک کہ محافظوں میں سے بھی کئی ہمت ہار بیٹھے ۔۔۔ اس میں شک نہ تھا کہ دونوں گاؤں کی یہ دونوں محافظ پارٹیاں دل وجان سے اپنے پڑوسیوں کو خطرے سے بچانے کا عہد کرکے نکلی تھیں۔ لیکن دوسروں کی زندگی بچانے کے لئے خود کو قربان کر دینے کی ہمت کسی کسی میں ہوتی ہے۔ پھر بھی لوگ اس بات سے انجان نہ تھے کہ لیٹرے ہندو سکھوں کے اس قدر دشمن نہیں تھے جتنے اُن کی حفاظت کرنے والوں کے۔

ایک دفعہ پھر بجلی پھر چمکی اور اُس کے اُجالے میں صاف دکھائی دے گیا کہ پہاڑی کے اوپر سے گذر رہی انسانوں کی یہ لمبی لائن لیٹروں کے علاوہ اور کسی کی نہیں۔ سبھی کے کندھوں پر لاٹھیاں، برچھیاں اور کلہاڑیاں تھیں کسی کسی کے پاس بندوقیں بھی تھیں۔ ایسا اندازہ لگا رہا تھا۔

اب بچاؤ کی صورت صرف یہی تھی کہ جس طرح ہو سکے سرغالی کی گپھا تک پہنچا جائے۔ بھلے ہی بہتوں کو یہ ترکیب ڈوبتے کے لئے تنکے جیسی معلوم ہوئی۔ وہ جانتے تھے کہ اگر لٹیرے والے نے اُنہیں دیکھ لیا تو تعاقب کئے بغیر نہ چھوڑیں گے۔ پھر بھی اُنہوں نے گپھا کی طرف بھاگنا شروع کیا۔

ہانپتے دھڑکتے آخر کسی طرح گپھا تک پہنچ گئے۔ نسیم نے دوسری تمام باتوں کا خیال ترک کر کے پہلا کام یہ کیا کہ وہ گٹھڑیاں جو عزیز نے اُٹھا رکھی تھیں اپنے سر پہ اُٹھا لیں۔ اور بابے کا بازو پکڑ کر کھینچتی ہوئی سب سے پہلے گپھا میں داخل ہو گئی۔ یہ جلد بازی اُسے شاید اس لئے کرنی پڑی کہ لمبے سفر کے بعد بابے کی طبیعت گھبرائی ہوئی تھی جسم بھی گرم ہو رہا تھا اُسے فکر ہوئی کہ بابا کہیں راستے میں بیمار نہ پڑ جائیں۔

گرتا پڑتا، ٹھوکریں کھاتا، لرزتے اور لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ بابا اُس کے ساتھ چلا آ رہا تھا۔ بغیر دیکھے بھالے اور اسی حالت میں اُس نے اپنی دھوتی کی پھینٹ سے ایک پڑ لتے میان والی کٹار نکال کر نسیم کو دیتے ہوئے کہا۔

"لے بیٹی! اِسے سنبھال کر رکھنا۔ عزت پر آ پڑے تو اِسے کام میں لانا۔ خواہ دشمن کو مارنا پڑے یا خود کو لیکن جیتے جی کسی کے ہاتھ نہ پڑنا۔"

نسیم نے کٹار لے لی۔

تیزی سے بابا کو گھسیٹتی اور چکر کاٹ کر نسیم ایسی جگہ پہنچی جہاں اُسکے

قدم نرم و نازک گھاس کو چھو رہے تھے۔ اور قریب ہی کسی چشمہ کے بہنے کی آواز بھی سُنائی دی۔

بابے کے آرام کے لئے نسیم نے اس جگہ کو پسند کیا اور ہاتھ پیروں سے ٹٹول کر سر کی گٹھڑیاں ایک ڈھلوان جگہ میں رکھ دیں اور پھر یہ خیال کئے بغیر کہ کون سا کپڑا گھٹیا یا بڑھیا ہے نکال کر زمین پر بچھا دیا۔ پھر بابے کو سہارا دے کر آہستہ سے اُس بچھونے پر لٹا دیا اور سامان میں سے ایک کمبل نکال کر اُسے اُڑھا دیا۔

بابے کے کپڑے بارش سے بھیگ گئے تھے۔ لیکن اُنہیں تبدیل کرنے کا وقت نسیم کے پاس نہ تھا۔ سردی سے بابے کے دانت بج رہے تھے۔ اور ہاتھ کی انگلیاں اکڑ گئی تھیں۔ نسیم نے بغیر یہ فکر کئے کہ اُس کے باقی ساتھی کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہوں گے بابے کے ہاتھ پیروں اور بازوؤں کو جلدی جلدی دبانا شروع کر دیا۔ اُس کے اپنے ہاتھ بھی کافی سرد تھے۔ جنہیں وہ مُنہ کی بھاپ اور بغلوں میں دبا دبا کر کافی دیر تک گرماتی رہی۔

اسی دوران اُسے باہر سے شور سُنائی دیا اور وہ بغیر کچھ سوچے سمجھے باہر کی طرف اُٹھ کر بھاگی ــــ!

•••

Mehdi Library
Kamalpura S N 15
Malegaon (Dist Nasik)

Makhdum Library
★ Kamalpura, S. N 15 ★
Malegaon (Dist. Nasik)

اپنی جگہ سے اُٹھ کر نسیم اس طرف دوڑی جدھر شور سنائی دے رہا تھا۔ اندھیرے میں آواز کی سمت وہ ٹٹول ٹٹول کر بڑھی چلی جا رہی تھی۔ اب اُسے عورتوں اور بچّوں کی چیخیں صاف سُنائی دینے لگیں۔

اُس کے قدم رُک گئے خطرے کے احساس سے اُس کا دل پریشان ہو اُٹھا۔ لیکن فوراً اُسے بابے کی کٹار یاد آ گئی۔ اُس نے جیب سے نکال کر اُسے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اور آگے بڑھی۔

بابے کو اس حالت میں چھوڑ آنے کی بے وقوفی پر پچھتا رہی تھی۔ اس کے قدم ایک مرتبہ پھر رُک گئے۔ وہ واپس لوٹنے لگی۔ لیکن جوں ہی ہائے مار ڈالا ــــ مار دو، پکڑ لو ــــ" آوازیں صاف سُنائی دینے لگیں۔ وہ پھر اُسی طرف چل پڑی۔

کھوئی کھوئی حالت میں وہ بغیر اس خوف کے کہ کوئی حملہ آور اُسپر

حملہ کر سکتا ہے وہ برابر چلاتی ہوئی آگے بڑھی جا رہی تھی ۔۔۔ "عزیز! بھائی۔ بھائی جان ۔۔۔ !! لیکن بے کار ۔۔۔!"

تب ہی اس نے دیکھا دور سے دو مشعلیں اس طرف اڑتی ہوئی چلی آ رہی تھیں۔ جن کی روشنی جس طرف گذرتیں نسیم کی پتلیاں اسی طرف گھوم جاتیں۔ کئی قد آور، خوفناک شکل کے لوگ نیزوں، تلواروں اور لاٹھیوں سے جو بھی ان کے سامنے آتا مار کر زمین پر گرائے جا رہے تھے۔

نسیم نے دیکھا ایک بڑھیا اوروں سے کچھ فاصلہ پر اپنے تینوں معصوم پوتوں کو اپنے جسم میں چھپائے بیٹھی تھی اور بغل میں بیٹھی ایک نوجوان لڑکی چلا رہی تھی۔ ان کے قریب پہنچتے ہی لٹیروں کے ہتھیار روشنی میں چمک اٹھے۔ نسیم کے دیکھتے دیکھتے بوڑھی اور اس کے پیچھے چھپے تینوں بچے لاشوں کے ڈھیر ہو گئے۔ پھر روتی ہوئی نوجوان لڑکی زد مضبوط بازوں کی گرفت میں آ کر پلک جھپکتے آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

نسیم نے ایک اونچی اور نوکیلی چٹان کی آڑ میں خود کو چھپا لیا۔ جہاں کسی گذرنے والے کی نظر نہ پڑ سکتی تھی۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے بہت کچھ دیکھا۔ مشعلوں کی روشنی میں رہ رہ کر چیخوں کی درد بھری آواز سنائی پڑتی اور پھر فوراً خاموش ہو جاتی۔ کئی نوجوان لڑکیوں کو اس نے جبراً لے جاتے ہوئے دیکھا۔ پھر دیکھا ٹرنکوں، بوریوں اور گٹھریوں کے اکٹھا کیے جانے کا نظارہ۔ پھر اس کی آنکھوں نے ایک اور دلشکن نظارہ دیکھا۔ عورتوں، مردوں کی گردنوں، جیبوں، ناک اور کان میں

جو کچھ بھی ملا اُسے نوچتے کھسوٹتے ہوئے۔ اُس نے لاشوں کے کپڑے ہٹا کر اُن کی ہر تہہ کو ٹٹولتے ہوئے دیکھا۔ اس کام میں اُنہیں کافی کامیابی حاصل ہو رہی تھی۔ بہت سی کی شلواروں اور قمیضوں کی جیبیں جو اُنہوں نے مُردوں کے جسموں پر سے اُتاری تھیں اُن میں سے کرنسی نوٹوں کے بلندے اور سونے کی سلاخیں وغیرہ نکل رہی تھیں۔

تیروں، تلواروں اور لاٹھیوں کے وار اس بے دردی سے کئے جا رہے تھے کہ پہلی ہی وار میں بدنصیب روح فنا ہو جاتی۔

اس قدر خوفناک نظارہ دیکھنے رہنا نسیم کے لیئے ناگوار ہو اُٹھا تو اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اُسے کچھ خیال ہی نہ رہا کہ کب تک وہ اسی حالت میں پتھر کی ڈھال کے ساتھ لگی کھڑی رہی۔

تھوڑی دیر بعد جب اُس نے اپنے جسم کو ہلانے کی کوشش کرتے ہوئے آنکھیں کھولیں تو گپھا میں تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اُسے پتہ نہ لگ سکا کہ یہ آگ کسی نے جان بوجھ کر لگائی تھی یا کسی مشعل کے گرنے سے خود بخود لگ گئی تھی۔ اُسی روشنی میں اُس نے دیکھا کہ چاروں طرف خون کی کیچڑ ہو رہی ہے۔ کئی لاشیں گپھا کی اونچی نیچی جگہوں پر بکھری ہوئی پڑی تھیں جن کے جسموں کو ہتھیاروں کی چوٹوں سے بُری طرح بگاڑ دیا گیا تھا۔

نسیم نے خوفزدہ ہو کر پھر آنکھیں بند کر لیں۔ نہ معلوم کب تک وہ اسی حالت میں کھڑی رہی۔ اُس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ ہوش میں ہے یا بے ہوش ہے۔

نسیم اُٹھ کھڑی ہوئی اور روشنی کی سمت میں بڑھنے کی کوشش

کرنے لگی۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں بڑھی چلی جارہی تھی۔ اُس کی ذہنی مشین رُک گئی تھی۔ کچھ بھی سوچنے کی طاقت اُس میں نہ رہ گئی تھی۔ اسی حالت میں وہ گپھا کے باہر جا پہنچی۔ باہر کی صاف ہوا لگتے ہی اُس کی ذہنی طاقت لوٹ آئی۔

باہر پتھریلے میدان میں پہنچ کر نسیم نے چاروں طرف نظر دوڑائی بادل ابھی تک بہت گھنے تھے۔ سورج بھی ابھی پورا نہ نکلا تھا۔ لیکن سامنے چٹانوں کے دھندلے سائے نظر آنے لگے تھے۔

"کچھ فاصلے سے اُسے سُنائی دیا۔۔۔ بھائیو! آپ بھی مسلمان ہیں۔ ہم بھی۔ ہم آپ کے سامنے خدا اور رسول صلعم کی دہائی دیتے ہیں۔ بہت ہو چکا۔ اب ختم کرو۔ پہلے ہی گھروں سے برباد ہو کر آئے ہیں یہ۔۔۔ مرے ہوؤں کو مارنے سے آپ کے ہاتھ کیا آئے گا؟ زیادہ سے زیادہ آپ ان کا مال، نقدی جو کچھ بھی اُن کے پاس ہے لے لیجئے۔۔۔"

اس کے جواب میں کہا جارہا تھا۔۔۔ "کون کہتا ہے آپ مسلمان ہیں۔ بلکہ کافر ہیں۔ اصلی کافر، جو کافروں کی امداد کر رہے ہیں۔ بھاگ جاؤ یہاں سے۔ ورنہ ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑیں گے۔"

باہر سے آئی روشنی میں اب اندر کی ہر چیز نظر آنے لگی تھی۔ ان نظاروں نے نسیم کے دماغ کو پھر ایک مرتبہ ناکارہ کر دیا۔ وہ بلند آواز میں روتی چیختی اپنے رشتہ داروں کے نام باری باری سے پکارتی ہوئی بھاگی چلی جارہی تھی۔ کہیں لاشوں کے گرد چکر کاٹتی ہوئی اور کہیں اُن کے اوپر سے پھاندتی ہوئی۔ اُس کی اپنی آواز کے علاوہ جو گپھائیں گونج کر

پھر لوٹ آئی تھی۔ کچھ بھی سنائی نہ دیتا تھا۔

اس دردناک اور بے ہوشی کی حالت میں نسیم کو بابے کی یاد آئی اور وہ گلا ہی نہیں دل پھاڑ کر چیختی ـــ

"باپو جی! ـــ باپو جی ـــ !! آپ کہاں ہیں ـــ ؟ خدایا اب میں کیا کروں ـــ ؟"

اور تب ہی اُس کے کانوں میں ایک آہستہ اور دور سے آتی ہوئی آواز آئی ـــ

رام رام کہتے رہو، دھرے رہو من دھیر

جسے سُنتے ہی اُس کے لڑکھڑاتے پاؤں میں طاقت آ گئی۔ وہ اُس آواز کی سمت میں بھاگی۔

جیوں ہی نسیم بابا جی کے قریب پہنچی۔ وہ اُن کے گلے سے جا لپٹی۔ اب اُس کے دل و دماغ جواب دے چکے تھے۔ اُس کا سر لڑھک کر بابا جی کے سینے سے جا لگا۔

اپنے سینے پر لیٹی ہوئے نسیم کے سر پر بابا آہستہ آہستہ ہاتھ پھیر رہا تھا جیوں ہی بابا نے دیکھا کہ وہ ہوش میں آ رہی ہے اُس نے پوچھا ـــ "نسیما! کیسی طبیعت ہے بیٹی!"

سر اُٹھا کر نسیم نے باپو کی پُرسکون اور پیار بھری آنکھوں میں جھانکا اور اُس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دباتی ہوئی بولی —

"بابا جی! آپ — ! آپ — !!"

"میں تیرے پاس ہوں بیٹی — !" باپو نے کہا۔

ایک جمائی لے کر نسیم ہوش میں آ کر بیٹھ گئی۔ اُس کی آنکھوں میں کئی طرح کے سوال دیکھ کر باپو نے بغیر اُس کے سوال کیے بتلایا۔

"بیٹی! جب تو مجھے چھوڑ کر چلی گئی اور اِدھر مار کاٹ شروع ہو گئی۔ میں بہت گھبرا گیا۔ آنکھوں کے سامنے یہ ظلم ہوتا دیکھ رہا تھا۔ مگر میں مجبور تھا۔ کچھ بھی نہ کر سکتا تھا۔ یہاں تک کہ اندھیرے میں چلنا بھی میرے لئے مشکل تھا۔ ناچار من مار کر بیٹھ رہا اور تیرے انتظار میں گھڑیاں گنتا رہا۔ پر تو مجھے یقین ہو گیا تھا کہ ہمارے سبھی ساتھی قتل کر دیے گئے ہیں۔ سپاہیا پہلے بھگوان سے اُن کی مرضی کے خلاف کچھ نہ مانگا تھا۔ آج پہلی مرتبہ میں گڑگڑایا کہ بھگوان! اگر تیری یہی مرضی ہے تو میں اس مرضی کے آگے سر جھکاتا ہوں۔ لیکن میری بچی مجھ سے نہ چھین۔ جب کہ بغیر مانگے تو نے مجھے سب کچھ دے رکھا تھا —" اس سے آگے وہ کچھ بھی نہ بول سکا۔

پانچ منٹ اسی خاموشی میں گزر گئے۔ یکایک نسیم اُٹھ کھڑی ہوئی — "بابو جی! ایک مرتبہ مجھے دیکھ لینے دیجیے باہر کی حالت۔" اس کے پیچھے لاٹھی سنبھالتے ہوئے بابا بھی اُٹھ کھڑا ہو گیا۔

"بیٹی — ! مجھے چھوڑ کر نہ جا۔ چل میں بھی ساتھ چلتا ہوں — مگر بچی! اب مجھے چھوڑ کر بھی جا جب میری آنکھیں ہمیشہ کیلئے بند ہو جائیں۔"

بڑی ہوشیاری سے ملبے کو ٹھوکروں سے بچاتی ہوئی سیما گپھا
کے باہری دروازے کی طرف سے چلی۔

سب سے پہلے اُن کی نظر جس چیز پر پڑی وہ ایک نہیں اکٹھی چار لاشیں تھیں، ایک ماں اور دو اُس کے ننھے بچے اور ایک ادھیڑ مرد جو شاید اُس کا شوہر رہا ہوگا۔ چاروں کی لاشیں ایک دوسرے کے اوپر پڑی ہوئی تھیں جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ مرنے سے پہلے ان بدنصیبوں نے ایک دوسرے سے لپٹ کر موت کے حملے کو برداشت کیا ہوگا چاروں کو اس بے رحمی سے کاٹا گیا تھا کہ نسیم اس منظر کو زیادہ دیر تک نہ دیکھ سکی اُس نے اپنی آنکھوں کو ہاتھوں سے چھپا لیا۔

وہاں سے ہٹ کر جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے گئے اُنہوں نے دیکھا اُن کے علاوہ وہاں کوئی زندہ نظر نہ آ رہا تھا۔ اس بدحالی میں اُنہوں نے پہلی عورت کی لاش دیکھی اور دوسری عورتوں کی بھی وہی حالت تھی۔ جن عورتوں نے چوری کے ڈر سے سبھی زیور اپنے ہاتھوں اور کانوں میں پہن رکھے تھے۔ اور آنچل میں چھپا لیے تھے کہ اگر چور اُن کی گٹھریاں پوٹلیاں لے جائیں تو کم از کم یہ تو اُن کے باقی رہ جائیں گے۔ لیکن ان زیوروں کو جس حیوانیت سے نوچا کھسوٹا گیا تھا وہ صاف ظاہر تھا۔

اس ہوش رُبا منظر کو دیکھتے ہوئے وہ باہر نکل آئے۔

باہر چمکیلی روشنی پھیل رہی تھی۔ بادل چھٹ چکے تھے اور پتھریلے میدان میں بے شمار لاشیں اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھیں۔

بابو جی کو دیکھ کر دُکھ ہوگا اس خیال سے سیما نے ملبے کو ایک

اونچے پتھر کی آڑ میں بٹھا دیا۔ اور خود آگے بڑھی۔ بابا کی دی ہوئی کٹار اُس نے ہاتھ میں لے لی۔

سب سے پہلے اُس کی نگاہ چودھری فضل کریم کے بیٹے فتح پر پڑی اور پھر اُس کے ساتھیوں کی لاشوں پر پڑی جو بے چارے اُن کی جان بچانے کے لیئے اپنے گھروں سے نکلے تھے۔ لیکن انہیں بچاتے بچاتے خود موت کے منہ میں چلے گئے۔

نسیم نے باری باری اُن سب پر عزت و احترام کی نگاہ ڈالی جس طرح کوئی اپنے پیر و مرشد کو دیکھتا ہے اُس کی آنکھیں اس وقت آنسوؤں سے پُر تھیں۔ بار بار یہ پچھتاوا اُن کے دل پر زخم لگا رہا تھا: اگر معلوم ہوتا کہ ان بے چاروں کو آج ہی مرنا ہے تو کیوں ہم انہیں ساتھ لے کر چلتے۔ ہم پر تو مصیبت سوار تھی ہی جو ہمیں ہر حالت میں برداشت کرنی تھی۔ لیکن یہ بے چارے ــــــ!"

جن دو آدمیوں کی تلاش میں وہ نکلی تھی خاص طور پر انہیں تلاش کرنے میں اُسے کوئی دقت نہ اُٹھانی پڑی۔ بوٹے شاہ اور عزیز کی لاشیں ساتھ ساتھ پڑی ہوئی تھیں اُن کے جسم گولیوں اور برچھیوں سے چھلنی ہو گئے تھے۔ دونوں لاشیں ایک دوسرے کے قریب پڑی ہوئی تھیں گویا مرنے والوں نے ایک دوسرے سے جدا ہونا پسند نہ کیا۔

کٹے کھمبے کی طرح نسیم کا جسم ان لاشوں پر گر پڑا ــــ

"دیدے ــــ! میرے ویر دلما کی جوڑی ــــ" پکارتی ہوئی وہ کبھی ایک سے لپٹ جاتی کبھی دوسرے سے ــــ

اصرار کر رہی تھی وہ ان دونوں سوئے ہوئے شیروں کو نیند سے بیدار کر رہی تھی۔ لیکن کون جاگتا ——؟ آخر سسکیاں بھرتے بھرتے اُسے باپ کا خیال آیا جسے وہ تنہا چھوڑ آئی تھی تو اسی طرح روتی پیٹتی وہ واپس لوٹ پڑی۔

باپ کی حالت اس وقت نسیم کو کچھ عجیب و غریب نظر آ رہی تھی۔ گویا اُس کے دل سے خوشی یا غم کے جذبات ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئے تھیں۔ وہ پہلے کی طرح ہی اپنے پاٹھ میں کھویا تھا —— "رام رام کہتے رہو ——"

نسیم کو روتے دیکھ بابا کہنے لگا —— "اُسکی مرضی یہی تھی بیٹی! صبر کر اُس کی مرضی کو کوئی بھی ٹال نہیں سکتا۔ کوئی بھی نہیں ٹال سکتا ——"

لیکن اس دلاسے نے نسیم پر اُلٹا اثر کیا۔ اُس کے گلے کی آواز رُندھ گئی اور اُس کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کی روانی میں تیزی آ گئی۔ وہ دیوانوں کی طرح باپ کی آغوش میں گر پڑی۔

سورج کی سرخی لمحہ بہ لمحہ زردی میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی —— باپ کی آغوش میں سر چھپائے نسیم گہرے خیالات میں غرق تھی۔ آخر باپ نے اُسے جھنجھوڑتے ہوئے پیار بھری آواز میں پکارا ——

"سو گئی کیا بیٹی ——!"

جواب میں نسیم خاموش رہی۔

"اُٹھ بیٹا! بابا نے پھر پکارا —— "شام ہونے سے پیشتر ہمیں

ڈرائی پہنچنا ہے۔ وہاں سے قریب ہی پکی سڑک ہے شاید وہاں ہمیں ملٹری کی کوئی گاڑی مل جائے۔"

"چلیئے بابوجی ۔۔۔!" کہتے ہوئے نسیم اُٹھ کھڑی ہوئی۔

راستہ بہت اوبڑ کھابڑ تھا۔ باباجی دائیں ہاتھ میں لاٹھی تھامے اور بایاں ہاتھ نسیم کے کندھے پر رکھے ہوئے سنبھل سنبھل کر چلے اُن کے ہونٹ بار بار وہی بھگتی بھرے الفاظ دوہرا رہے تھے۔

دوپہر ڈھل رہی تھی۔ اور دونوں مسافر مسلسل چلے جا رہے تھے میلوں تک خوفناک جنگل تھا۔ نہ کوئی سڑک تھی اور نہ کوئی پگڈنڈی ۔۔۔ باباجی اپنے اندازے سے ہی چلے جا رہے تھے۔ کیونکہ اپنی زندگی میں وہ کئی دفعہ اس مقام سے گزر چکے تھے۔

شام اُترنے لگی تھی اور اس کے ساتھ اُن کی فکروں میں بھی اضافہ ہونے لگا تھا۔ اگر راہ میں ہی اندھیرا ہو گیا تو آگے کس طرح بڑھیں گے۔ ایک مرتبہ اگر راستہ بھٹک گئے تو پھر نہ معلوم کدھر جا نکلیں۔

چلتے چلتے یکایک نسیم کو سرد اور نم ہوا کا جھونکا نسیم کے چہرے کو چھوتا ہوا محسوس ہوا۔ اور اس کے ساتھ ہی سائں سائں کی دھیمی آواز بھی اُسے سنائی دی گویا اس ویران جنگل میں موسیقی کا دیوتا اپنی ڈنیل کے تاروں کو چھیڑتے گیتوں کی شیرینی بانٹ رہا ہو۔

"بابوجی!" نسیم نے پوچھا ۔۔۔ "یہ کیسی آواز ہے؟"

"سہاں کی ۔۔۔!" بابے نے جواب دیا۔

یہ سن کر نسیم کا دل جھوم اُٹھا۔ اس کے قدموں میں تازگی آ گئی۔

"میرا سہاں، میرے بچپن کا ساتھی، میرے خوابوں کا ساتھی

میری نشیبوں کا ساتھی ___ میرا سہال ___" وہ پکارنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد نسیم سہال کے کنارے بیٹھی ہوئی اُس کے ٹھنڈے صاف شفاف پانی کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ بابا جی بھی اپنی تھکان دور کرنے کے خیال سے کچھ فاصلے پر ہری ہری گھاس پر لیٹ گئے۔

معصوم بچی کی طرح نسیم بہتے ہوئے پانی کو اُچھالتی ہوئی اُس سے باتیں کر رہی تھی ___ "میرے سہال کے پانی! تم چکری سے گزرا ہوگا۔ ہمارے گاؤں کی دیواروں کو چھو کر آیا ہوگا۔ میں تجھے کبھی بھی نہ بھولوں گی رے میرے پیارے سہال! کبھی میں تیرے کنارے بیٹھوں گی کبھی تجھ میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ تیروں گی ___!

___ ارے تو بولتا کیوں نہیں ___ ! آؤ میرا میرا ___"

یکایک کسی ہاتھ کے چھو جانے اور ایک آواز نے نسیم کی اس تنہا گفتگو کو روک دیا۔ بابا اُس کا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہہ رہا تھا ___ "چھوڑ بیٹی اس آؤ کو۔ ہمیں ابھی کافی دور جانا ہے ___"

نسیم کے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ وہ اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اور بابے کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگی ___ "بابو جی! ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"بیٹی!" بابے نے جواب دیا ___ "تم بہتے ہوئے پانی سے پوچھ یہ کہاں جا رہا ہے؟ کیا تجھے یہ بتا سکے گا؟"

"مگر بابو جی!" نسیم گویا خواب میں بول رہی تھی۔ ایک سرد آہ بھر کر پوچھنے لگی۔ ہم پھر کبھی نہیں آئیں گے اپنے وطن؟"

"بابے کا جسم لرز اُٹھا۔ اُس نے چاہا کہ سر ہلا کر یا زبان سے "نہ" کہہ کر اس لڑکی کے سوال کا جواب دے۔ لیکن یہ لفظ کوئی دوسری ہی شکل اختیار

کر کے اُس کی زبان سے نکلا۔ اُس کا بے سُرا گلا الاپنے لگا۔

"اللہ ہی اللہ کہہ اور گھٹنڈے سے دم نہ بھر —"

"نسیم اپنا سوال بھول چکی تھی۔ شلوار کے پائنچوں کو گھٹنوں تک چڑھا کر وہ بائیں کو ہوشیاری سے بڑھتے ہوئے سہاں کے پانی کو چیرتی ہوئی دوسرے کنارے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اور سہاں کی تھکی دنیا جیسی آہستہ آواز سہاں سہاں کے گیت کے سُر میں "اللہ اللہ کہہ۔" کی صدائیں کر دلکش سماں باندھ رہی تھی۔ سہاں پار کرنے کے بعد دو تین فرلانگ آگے جا کر نسیم نے ایک گھنے اندھیرے کو دیکھا، وہ دُور نالے کا وُں کا پیپل کا پیڑ تھا۔

دونوں مسافر جنہیں اپنی منزل کا پتہ تھا، اس تاریک اور ناامید بیابان سے بھری دنیا میں بغیر کسی اندازہ کے اسی درخت کی سمت میں بڑھے چلے جا رہے تھے۔ اُن کی پُر درد نگاہیں اس وقت بھی اور یادوں کے ذریعے قیامت آمیز اور دکھ بھرے انجام کو دیکھتی جا رہی تھیں۔ ملیے کی لاٹھی پتھروں سے بج بج کر ایک بے ٹھری آواز پیدا کر رہی تھی اور اس آواز میں شامل ہو کر ایک لرزتی ہوئی آواز جنگل کی خاموشی کو چیر رہی تھی۔

رام رام کہتے ہو دُھرے موکن دھیر
کارج آپ سنواریں گے را کہیہ رگھو ویر

ختم

ISCUS LIBRARY
MALEGAON DIST. NASIK